مین ہوا ہے، جس نے بگڑ کر شرک کی صورت اختیار کر لی، پرانی مناظرانہ کتابون مین اس پر بڑی بحثین اور توحید کے اثبات اور شرک کی تردید کے پرانے طرز کے دلائل کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، مصنف نے انہی مین سے اپنے پسندیدہ دلائل منتخب کر کے اس کتاب مین جمع کر دیئے ہین، اس کے پہلے حصہ مین توحید باری کے ثبوت اور تعدد الٰہ کی تردید کے دلائل ہین، دوسرے مین ان عقائد و اعمال کی تردید ہے، جو توحید خالص کے خلاف اور مسلمانون مین بھی رائج ہین، جیسے غیر اللہ سے استمداد اور علم غیب وغیرہ مصنف کو موجودہ زمانہ کے کلامی مسائل اور ان کے طرز استدلال کا اندازہ نہین ہے، اس لئے انھون نے انہی پرانے مسائل اور دلائل کو دہرا دیا ہے جن کی آج کل چندان ضرورت نہین، اور نہ ان کو موجودہ مذاق قبول کر سکتا ہے، تاہم مصنف کی نیت اور ان کا مقصد نیک ہے، اس لئے انشاء اللہ اس کا اجر ان کو ملے گا،

مادر ہمدرد از جناب خواجہ حسن نظامی دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ امیر خسرو ہرڈیو لائبریری دہلی،

ایک مدت کے بعد خواجہ صاحب کی نئی تصنیف کی زیارت ہوئی ہے، ان کی تحریر کے مطابق اس تصنیف کا مقصد باشندگان ہندوستان و پاکستان کے کلچر اور قدامت کی مادری تربیت کے عمدہ نتائج کا بیان ہے" اس مقصد کے مطابق مصنف نے ہندوستان کے بہت سے قدیم صلحاء و اخیار اور موجودہ دور کے اکابر و ممتاز آدمیون کے مختصر حالات مادری تربیت کے اچھے نمونے کی حیثیت سے لکھے ہین، لیکن ان مین کم ایسے ہین جن کے متعلق یہ ثبوت دیا گیا ہو کہ ان کے محاسن مادری تربیت کا نتیجہ تھے، ہر شخص کے اوصاف کو مادری تربیت کا لازمی نتیجہ نہین کہا جا سکتا، جب تک اس کا ثبوت موجود نہ ہو، ورنہ اگر اس کو بطور کلیہ کے مان لیا جائے، تو پھر ہر انسان کو مادری تربیت ہی کا نمونہ ماننا پڑے گا، جو ایک غیر منطقی بات ہے، تاہم اس کتاب سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس مین ہر طبقہ کے بہت سے اکابر و ممتاز شخصیتون کا تذکرہ جمع ہو گیا اور اس سلسلہ مین مصنف نے اپنے خاندان و متوسلین کا حق بھی ادا کر دیا،

"م"

جلد ۶۵ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۰ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ہم کو اخبار نوائے وقت لاہور کے ایک نوٹ کا تراشہ موصول ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ پنجاب کا کوئی خود غرض ناشر دارالمصنفین کی کتابوں کو چھپوا رہا ہے، اور چند سکوں کے لئے ہندوستان کے اس اسلامی ادارہ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے، اڈیٹر صاحب نوائے وقت نے اپنی انسانی شرافت اور دینی حمیت سے اس کے خلاف حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:

آج یہ افسوسناک اطلاع ملی ہے کہ پنجاب کے کوئی ناشر صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ساری کتابیں بلا اجازت چھپوا رہے ہیں، اور اپنے نام سے بیچیں گے، اس سے پہلے حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری پر بھی ظلم ہو چکا ہے، وہ اب ایک ادارہ اس ظلم کا شکار ہو رہا ہے، یہ حرکت مذہب، اخلاق، قانون، شرافت، ہر معیار سے گری ہوئی ہے اور اب جو ناشر اس کے ارتکاب کا ارادہ رکھتا ہے، وہ انسانیت کے ابتدائی معیار سے بھی گرا ہوا ہے، مزید براں اس ظالم کو اس امر کا بھی احساس نہیں کہ دارالمصنفین ایک ایسا ادارہ ہے جو سالہا سال سے مولانا سید سلیمان ندوی کی سرکردگی میں مسلمانوں اور اردو زبان و ادب کی بڑی خاموشی سے خدمت انجام دے رہا ہے، ہندوستان میں جو حالات رونما ہیں، ان کی وجہ سے دارالمصنفین اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے، چاہئے تو یہ تھا کہ پاکستان کے مسلمان اس مفید ادارہ کی مدد کرتے، مگر ہو یہ رہا ہے کہ اس کا ایک ناشر ذاتی نفع کی لالچ میں ادارہ کی آمدنی کا واحد ذریعہ یعنی اس کی کتابیں چھاپ کر اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے، یہ ناشر اس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ اسے اس بات کا بھی خیال نہیں کہ اس کے اس فعل سے ساری پاکستان کی بدنامی ہوگی، ہم سردار عبدالرب نشتر سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ خود توجہ فرمائیں، اور اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں، اور اس ناشر کی مطبوعہ کتابیں

باہر آتے ہی ضبط کر لیجائیں، اور بہتر یہ ہے کہ انھیں دارالمصنفین بھیج دیا جائے، ہمیں بتایا گیا ہے کہ پہلی کتاب جو باہر آئے گی وہ مولانا شبلی مرحوم اور سید سلیمان ندوی کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، (نوائے وقت ۱۵ مارچ ۵۰ء)

یہ نوٹ لکھ کر معاصر موصوف نے جس انسانی شرافت، اسلامی اخوت اور دینی حمیت کا ثبوت دیا ہے ہم اس کے شکرگذار ہیں جَزَاہُ اللّٰہُ عَنَّا وَعَنِ الْمُسْلِمِیْنَ، اس سے زیادہ ہم بھی اور کیا لکھ سکتے ہیں، لیکن اہل پاکستان کی خدمت میں اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کر دینا ہے،

ہندوستان کی تقسیم سے بھارت کے اسلامی اداروں کو جو نقصان پہنچا ہے، اس سے دارالمصنفین بھی محفوظ نہیں، وہ چونکہ اسلامی علوم و فنون اور اردو زبان و ادب کا ادارہ ہے، اور اس کی کتابیں انہی موضوعوں پر ہیں، اس لئے ہندوستان کی تقسیم سے پہلے بھی ان کے خریدار قریب قریب کل مسلمان اور پاکستانی علاقہ تھا، ہندوستان میں انکی مانگ زیادہ تر دلی اور حیدرآباد میں تھی، اس لئے موجودہ انقلاب کا اثر دارالمصنفین کی تجارت پر بہت بڑا پڑا، اور بھوپال سے تھوڑی بہت جو امداد ملتی ہے، وہ چند دنوں کی مہمان ہے، اور اب اس کا مدار بڑی حد تک پاکستان کی تجارت پر رہ گیا ہے، دونوں ملکوں کے درمیان سکہ کے اختلاف نے اور بھی مشکلات پیدا کر دی ہیں، لیکن وہ عارضی ہیں اور یقین ہے کہ دیر سویر اس کا کوئی حل نکل آئے گا، اور اس وقت بھی پاکستان کتابیں جا رہی ہیں،

ان اسباب کی بنا پر دارالمصنفین بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے جس کا تذکرہ ان صفحات میں کیا جا چکا ہے، ان حالات میں اگر پنجاب کے کسی ناشر نے اس کی کتابیں چھپوا کر بیچنا شروع کر دیں، تو اس کی تجارت بالکل ختم ہو جائیگی، اور اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائیگا، دوسری مملکت کی وجہ سے سردست اس کا قانونی تدارک مشکل ہے، گو انشاء اللہ اس کی کوئی نہ کوئی تدبیر کی جائیگی، لیکن یہ ہم سے زیادہ اہل پاکستان کا فرض ہے کہ اگر وہ ہندوستان میں اسلامی آثار کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، تو پاکستان اور پنجاب دونوں حکومتوں کو اس ننگ اسلام و ننگ انسانیت تاجر کو ایسی عبرت انگیز سزا دینی چاہئے کہ پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو، ہم کو یقین ہے کہ معاصر نوائے وقت کی طرح پاکستان خصوصاً لاہور کے دوسرے اخبارات بھی اس ناشر کے خلاف لکھیں گے، اور حکومت بھی ہمارے معروضات پر توجہ کرے گی، ورنہ پاکستان کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کا بہت کچھ نثار ہو چکا ہے، ایک دارالمصنفین اور سہی، معاصر نوائے وقت سے اس ناشر کا نام معلوم ہو سکتا ہے،

پروفیسر محمد نعیم الرحمن مرحوم ریڈر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کی وفات علمی حلقہ کا بڑا المناک سانحہ ہے، مرحوم مشہور مصنف و مترجم مولوی خلیل الرحمن صاحب مرحوم صاحبِ اندلسیات کے خلف الصدق اور خود نامور صاحبِ علم، اور علم و فن کے خدمت گذار تھے، عربی فارسی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور عبرانی سے بھی واقف تھے، عربی زبان سے ان کا تعلق محض درس و تعلیم تک محدود نہ تھا، بلکہ ان کو اس کا ذوق اور ان میں اس کی خدمت کا جذبہ تھا، انجمن عربی صوبہ متحدہ کے معتمد اور اس کے سرگرم کارکن تھے، انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کی اہمیت اور مسلمان طالب علموں میں اس کا ذوق قائم رکھا، بہت سے علمی اور تعلیمی اداروں کے رکن اور ممبر تھے، تصنیف و تالیف سے بھی ذوق تھا، متعدد کتابوں کے مصنف، مترجم اور مرتب تھے، عربی و فارسی کی بہت سی درسی کتابیں لکھیں، ان کی قلمی یادگاروں میں مورخ عبد الواحد مراکشی تمیمی کی المعجب فی تلخیص اخبار المغرب کا اردو ترجمہ خلافت موحدین خصوصیت کے ساتھ لائقِ ذکر ہے، مرحوم کی عمر پچپن چھپن سال سے زیادہ نہ تھی، اور صحت ایسی تھی کہ مشکل سے چالیس سال کے معلوم ہوتے تھے، چند مہینے بیمار رہ کر ۱۴ فروری کو انتقال کیا، اللہ تعالیٰ اس خادمِ علم کو نعیمِ جنت سے سرفراز فرمائے،

حافظ ابن قیم نے قرآن مجید کی بعض چھوٹی سورتوں کی تفسیر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں لیکن قرآن کی کوئی مستقل تفسیر ان کی یادگار نہیں ہے، مگر ان کی کتابوں میں مختلف مباحث کے سلسلہ میں اُن کے قلم سے متفرق سورتوں کی آیات کی تفسیریں ملتی ہیں، ہمارے پرانے رفیق مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی نے دار المصنفین کے قیام کے زمانہ میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے ایما سے ان تفسیروں کو تلاش کر کے جمع و مرتب کیا تھا، اب یہ تفسیر التفسیر القیم کے نام سے محمد حامد الفقی رئیس جمعیۃ انصار السنۃ المحمدیۃ کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں مکہ مکرمہ سے چھپ کر شائع ہو گئی ہے، اسکی ضخامت ۳۰۰ صفحے ہے، اس کے لائق مرتب اور اس کے ناشر عبد اللہ و عبید اللہ صاحب دہلوی تاجران مکہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اہلِ علم کو اس تفسیر سے استفادہ کا موقع دیا، اگر اللہ تعالیٰ کسی صاحبِ علم کو اسی طریقہ سے امام ابن تیمیہ کی تفسیر کی جمع و ترتیب کی توفیق دیدیتا تو ایک بڑا کام ہو جاتا،

سکہ کے اختلاف کی وجہ سے پاکستان وی پی نہیں جا سکتے، لیکن پاکستان کے معارف کے اُن خریداروں کے نام بھی جن کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے پرچہ برابر جاری ہے، اب اُن سے التماس ہے کہ وہ اس کا چندہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور کے نام بھیج دیں، ہم کو توقع ہے کہ جس طرح اُن کے اعتماد پر معارف جاری رکھا گیا، اسی طرح وہ بھی چندہ بھیجنے میں تاخیر نہ کریں گے،

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں

فنونِ جنگ

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

(۲)

میدان کی جنگ کے طریقے

میدانِ جنگ کا انتخاب

عام طور سے معرکۂ کارزار کے لئے ایک بہت ہی وسیع اور کشادہ میدان منتخب کیا جاتا تھا، جس کے لئے حسب ذیل چیزوں کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا تھا:

(۱) میدان آبادی سے زیادہ دور اور نہ نزدیک ہو،

(۲) اس کی زمین سخت ہو لیکن پتھریلی نہ ہو تاکہ گھوڑوں کے کھر زخمی نہ ہونے پائیں،

(۳) زمین گیلی اور ریتیلی نہ ہو تاکہ فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہو،

(۴) زمین پر زیادہ گرد و غبار نہ ہو تاکہ جنگ کی شدت کے وقت گرد کے بادل اس میں حارج نہ ہوں،

(۵) اس کے آس پاس پانی آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہو[۱]،

میدانِ جنگ میں نظری سہولت اور مدافعت بھی مدنظر رکھی جاتی تھی، مثلاً خسرو خان غیاث الدین

[۱] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۷ء،

تغلق سے جنگ کرنے کے لئے سیری سے باہر آیا، تو اُس نے حوض علائی کے پاس جنگ کے لئے اس طرح میدان منتخب کیا کہ حوض علائی کے سامنے باغات تھے، اور پشت پر دہلی کا حصار تھا، محمد تغلق اودھ کے حاکم عین الملک کی بغاوت فرو کرنے کے لئے قنوج پہنچا، تو لڑائی کے وقت اس کے لشکر کی پشت پر شہر قنوج اس کی محافظت کر رہا تھا،[۵۵]

کبھی غنیم کے راستے کو مسدود کرنے کے لئے لشکر گاہ اور میدانِ جنگ کے چاروں طرف خندق کھود دی جاتی تھی، اور خندق کے گرد لکڑی کا حصار بنا لیا جاتا تھا، علاء الدین مغلوں سے سیری کے پاس جنگ کرنے آیا، تو مولانا برنی رقمطراز ہیں،

"سلطان علاؤالدین باندک سوارے کہ در شہر داشت از شہر بیرون آمد و در سیری لشکر گاہ کرد و از غلبۂ مغل و ہجوم مغل سلطان را ضرورت شد کہ گرد بر گرد لشکر خود خندق کاوانید و بر گرد خندق از تختہ ہائے درہائے خانہائے مردمان حصار چوبی بید انید و راہ در آمد مغلان را در لشکر گاہ خود مسدود کرد،"[۵۷]

شیر شاہ ہر جنگ میں اپنی لشکر گاہ کے ارد گرد خندق کھدواتا، اور مٹی کا حصار بنواتا تھا، اس کا حریف ملوخان (والی منڈو، اجین، سارنگ پور وغیرہ) سپر ڈال کر اس سے ملنے آیا تو عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ

"شیر شاہ نے ملوخان کو اپنے تمام لشکر کی ترتیب دکھائی جس کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا، کبھی اس نے ایسی فوج نہیں دیکھی تھی، جس وقت بادشاہ کا چتر سواروں کو دکھائی دیا، تو وہ اپنی تلواریں میان سے نکال کر چتر کی طرف دوڑے آئے، اور گھوڑوں سے اُترے، سواروں کے کل دستوں نے اس طرح سلام کیا کہ وہ لڑائی کے دن کیا کرتے تھے،

---

۵۵ برنی ص ۱۱۹، ۵۶ ابن بطوطہ ص ۱۰۰، ۵۷ برنی ص ۲۱۰،

جب اس کو معلوم ہوا کہ ہر منزل میں سپاہی ایسی محنت و مشقت کرتے ہیں اور لشکر کے گرد خندق کھودتے ہیں، اور قلعہ بناتے ہیں، تو اس کے ہوش اڑ گئے، اُس نے افغانوں سے کہا اللہ اکبر! کیسی محنت کرتے ہو، لمحہ بھر آرام لینا حرام جانتے ہو، افغانوں نے کہا کہ ہمارے بادشاہ کا بھی اسی طرح محنت کرنے کا دستور ہے، اس لئے ہم کو بھی محنت و مشقت کی ایسی عادت ہو گئی کہ اس سے کلفت مطلق نہیں معلوم ہوتی ہے، سپاہی کو چاہئے کہ اپنے بادشاہ جیسی بھی محنت و مشقت و خدمت لینی چاہے، اس کو کرنے سے وہ تنگ نہ آئے، آرام کرنا عورتوں کا کام ہے، نیک مردوں کے واسطے آرام کرنا شرم کا مقام ہے"[۵۸]

آگے چل کر عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ شیر شاہی لشکر کے گرد خندق کھودنے میں بڑے بڑے امراء بیلداروں کی طرح پھاوڑے چلاتے تھے، ملو خان کو خوف ہوا کہ کہیں اس کو بھی بیلداری نہ کرنی پڑے، اس لئے شیر شاہ کو چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ فرار ہو گیا،[۵۹] ۹۵۰ھ میں شیر شاہی لشکر ناگور، اجمیر اور جودھپور کی طرف روانہ ہوا، تو ریگستانی علاقوں میں ریت کی وجہ سے قلعہ اور خندق تیار نہ ہو سکی، شیر شاہ کے پوتے محمد خان بن عادل خان نے پھر یہ ترکیب کی کہ تھیلوں میں ریت بھر کر قلعہ بنایا،[۶۰]

مندرجۂ بالا باتوں کا خیال تیموریوں کے زمانہ میں بھی کیا جاتا تھا، تیمور "تزوک جنگ و جدل" کے سلسلہ میں لکھتا ہے :-

"امر نمودم کہ امیر الامراء در زمین جنگ گاہ چہار چیز ملاحظہ نماید، **اوّل** آب آن سرزمین، **دوم** زمینے کہ سپاہ را نگاہ دارد، **سیوم** کہ بر غنیم مشرف باشد و آفتاب

---

۵۸ تاریخ شیر شاہی مصنفہ عباس خان سروانی بحوالہ ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۹۲-۳۹۳، نیز دیکھو تاریخ ہند جلد سوم مصنفہ شمس العلما محمد ذکاء اللہ ص ۲۰۰، ۵۹ ایلیٹ جلد چہارم ص ۴۰۵، ذکاء اللہ ص ۳۱۹،

روبرد نباشد تا شعاع آفتاب چشم سپاہ را خیرہ نگرداند چہارم پیش روے جنگ گاہ

کشادہ و دراباشد[۱]

میدان جنگ میں مذکورۂ بالا سہولتیں میسر ہو جاتیں تو تیموری لشکر کے سپاہی ایک بے پناہ قوت بن کر دشمنوں سے لڑتے، اور فتح و کامرانی حاصل کرتے، چنانچہ ان کی میدان جنگ کی برد آزمائی اور معرکہ آرائی کا خوف اور رعب اُن کے مخالفوں پر ہر زمانہ میں رہا، ہندوستان کی سب سے بڑی بہادر قوم یعنی راجپوت بابر سے میدان کنواہا میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد اپنا تحفظ اسی میں سمجھتے تھے کہ تیموریوں کے خلاف حصار اور قلعے میں محصور ہو کر اپنی مدافعت کریں،

اگر مذکورۂ بالا سہولتیں میسر نہ ہوتیں تو شاہی لشکر کو بڑی دقتیں اور مشکلیں پیش آتیں جو سنا کی جنگ میں ہمایوں کو شیر خان کے مقابلہ میں جو شکست ہوئی، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمایوں کی فوج کو خاطر خواہ میدان جنگ نہیں ملا، دونوں مخالف فوجیں گنگا کے ساحل پر مقیم ہوئیں، دونوں کے درمیان گنگا کی ایک شاخ پچیس گز چوڑی بہتی تھی، شیر خان نے سبقت کرکے ایک ایسے مقام پر اپنی فوج کو لاکر کھڑا کیا، جو اس کے لئے ہر طرح مفید ثابت ہوا، ہمایوں کی فوج کو مجبوراً ایسی جگہ قیام کرنا پڑا جہاں کی زمین بہت ہی ڈھلوان تھی، اس کی گہرائی میں کیچڑ اور دلدل ایسی تھی کہ سوار اور گھوڑے اس میں پھنس کر رہ جاتے تھے[۲]،

اکبری عہد میں گڈہ کی رانی درگاوتی کے خلاف خواجہ آصف خان نے لشکر کشی کی تو رانی درگاوتی نے کھلے ہوئے میدان میں آنے کے بجائے نرہی کے پاس اپنی فوج کا پڑاؤ اس طرح ڈالا کہ اس کے چاروں طرف سر بفلک پہاڑ تھے، ارد گرد درختوں کے گھنے جنگل تھے، سامنے دریائے گور تھا، اور اس کے دوسری

[۱] تزوک تیموری ص ۱۹۱ [۲] تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی بحوالہ ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۷۰ و ذکاء اللہ جلد دوم ص ۲۹۳،

طرف دریائے نربدا تھا، اس دریا کے پاس ایک پہاڑی پشتہ (گریوہ) تھا جس سے ہو کر نرہی کا راستہ جاتا تھا، لیکن یہ راستہ بہت ہی تنگ اور ہولناک تھا چنانچہ رانی درگاوتی کے لشکر کے ناکے بہت ہی دشوار گذار تھے، تیموری فوج کو رانی کے لشکر تک پہونچنے کے لئے بظاہر کوئی ذریعہ میسر نہ تھا، مگر شاہی فوج کے دلیر اور بہادر سپاہی جانبازی سے کام لے کر پہاڑی پشتہ پر پہنچ گئے، اور یہاں اپنی توپوں کا ایک مورچہ بنا کر اتنی زبردست آتشباری کی کہ رانی درگاوتی کے لشکریوں کو کٹ مرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا[۱]،

ابراہیم حسین مرزا کے خلاف اکبر گجرات میں معرکہ آرا ہوا تو اس کی سب سے بڑی دقت میدان جنگ کی سرزمین تھی، جو بہت ہی خراب اور کانٹوں سے بھری تھی، دو سوار پہلو بہ پہلو ساتھ گذر نہیں سکتے تھے ان خاردار جھاڑیوں سے فائدہ اٹھا کر غنیم کے دو سواروں نے اکبر پر حملے کئے اکبر کے فوجی سردار پاس ہی کھڑے تھے مگر جھاڑیاں بیچ میں حائل تھیں، اسکی مدد کو نہ پہنچ سکے اکبر نے غیر معمولی سرعت کی جھاڑیوں کے اوپر سے اپنے گھوڑے کو جست کرایا اور دشمنوں کا مقابلہ کیا[۲]،

خان اعظم مرزا کوکہ نے سلطان مظفر گجراتی کے خلاف لشکر کشی کی، تو دونوں فوجیں سابرمتی کے پاس مدمقابل ہوئیں لیکن شاہی لشکر کو زمین کے نشیب کی باعث پیچھے ہٹنا پڑا[۳]،

اوڑیسہ میں افغانوں نے اکبر شاہی فوج کا مقابلہ کیا تو مٹنا پور میں انھوں نے اپنی فوج کو اس طرح کھڑا کیا کہ بیچ میں جنگل تھا اور اس کے چاروں طرف ایک دریا بہتا تھا شاہی فوج کی باگ راجہ مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی، اس نے پیش قدمی کرکے غنیم کی فوج کے نزدیک ایک سرکوب پر قبضہ کر لیا اور وہاں فوراً ایک قلعہ تعمیر کر لیا، جہاں سے توپوں کی آتشباری کرکے دشمنوں کو پسپا کیا[۴]،

شاہجہانی عہد میں اوزبکوں نے شاہی فوج کا تسلط اور اقتدار اپنے ملکوں میں اس لئے قائم نہیں ہونے دیا کہ وہ دروں میں چھپ چھپ کر شاہی فوج کی غارتگری کرتے تھے، عالمگیری عہد میں آسام کے علاقوں میں مگھ اور اہوم کی مخالفت محض اس لئے جاری رہی کہ وہ جنگلوں اور بحری دروں

[۱] اکبر نامہ جلد دوم ص ۲۱۳-۲۱۲ [۲] ایضاً جلد سوم ص ۱۵ [۳] اکبر نامہ جلد سوم ص ۵۹۳ [۴] ایضاً ص ۶۱۱-۶۱۳،

مین لڑنے کے عادی تھے، مرہٹے پہاڑیون مین چھپ چھپ کر تیموری فوج کا مقابلہ کرتے رہے، اس لئے تیموری ان پر غلبہ حاصل نہ کر سکے،

میدانِ جنگ مین فوجین صف آرا ہوتین تو تیموری بھی لشکر گاہ کی مدافعت کے لئے مختلف تدبیرین اختیار کرتے تھے، امیر تیمور جب محمود تغلق کے خلاف جمنا کے کنارے جنگ کرنے آیا تو اُس کے لشکر گاہ کے چارون طرف خندق کھودی گئی، وہ خود لکھتا ہے،

"واین جہت در دور لشکر خندق کندم، و میانِ خندق خود را استوار ساختم"[1]

ہاتھیون کو پسپا کرنے کے لئے تیمور نے صف لشکر کے آگے چپرون سے حصار بنایا، اور اس کے گرد خندق کھودی، خندق کے سامنے بھینسون کی گردنون اور ٹانگون کو چمڑے سے باندھ کر اُن کو کھڑا کیا، اور آہنی کانٹے بنا کر پیادون کو دیئے کہ ہاتھی حملہ آور ہون تو یہ کانٹے راستہ مین بکھیر دیئے جائین[2]

بابر نے پانی پت کے میدان مین اپنی لشکر گاہ کا تحفظ اس طرح کیا کہ داہنی طرف پانی پت شہر کے محلے اور مکانات کی آڑ لی، سامنے توپون کے ارابے اور مٹی کے توبرے رکھے، بائین طرف خندق کھود کر درختون کی شاخون کی باڑ لگائی،[3] کنواہا کی جنگ کے موقع پر بھی بابر نے اپنی لشکر گاہ کو ارابون اور خندقون سے مستحکم کیا تھا،[4] ہمایون کے خلاف سلطان بہادر مانڈسور مین صف آرا ہوا، تو اُس نے لشکر کے گرد خندق ہی کھود کر ہمایون کا مقابلہ کیا، طبقات اکبری مین ہے،

"رومی خان نے جس کے اختیار مین سلطان بہادر کا توپ خانہ تھا، کہا کہ صفون کی جنگ مین توپ و تفنگ کام نہین آتا ہے، توپ خانہ تو کافی فراہم کر لیا گیا ہے چنانچہ قیصر روم کے سوا اس قسم کا توپ خانہ کسی اور کے پاس نہین، لیکن مناسب یہ ہو کہ لشکر کے گرد خندق کھود دی جائے، اور ہر روز جنگ ہو، اور جب مغلون کے لشکر مقابلہ مین آئین گے

[1] تزک تیموری ص ۸۴، [2] ظفر نامہ جلد دوم ص ۱۰۲، [3] بابر نامہ ص ۲۶۶ [4] ایضاً صفحہ ۳۱۰

تو توپ و تفنگ کی ضرب سے ان مین سے اکثر ہلاک ہو جائین گے، سلطان بہادر نے یہ رائے پسند کی، اور اپنے لشکر کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا، دو ماہ کی مدت تک دونون لشکر ایک دوسرے کے مقابل مین پڑے رہے،[1]

ابو الفضل کا بیان ہے کہ خندق کے چارون طرف ارابہ کا حصار بھی بنایا گیا اور حصار پر توپین نصب کر دی گئین، مگر توپون کی یہ قلعہ بندی کام نہین آئی، ہمایون نے حصار کے باہر توپون کی زد سے دور تیر اندازون کی ایک بڑی جماعت دشمنون کی رسد کو تاراج کرنے کے لئے مقرر کر دی، چنانچہ ہر طرف سے سلطان بہادر کی فوج کی رسد بند ہو گئی جس سے لشکر مین بڑی سراسیمگی پھیل گئی، اور یہ توپخانہ کا قلعہ قید خانہ بن گیا، بالآخر سلطان بہادر ہلکی سی جھڑپ کرنے کے بعد توپخانہ مین آگ لگا کر فرار ہو گیا،[2]

۹۹۲ھ مین اکبر نے سلطان مظفر گجراتی سے احمد آباد کے پاس سرکیج مین جنگ کی، تو شاہی فوج کے ایک طرف شہر اور دوسری طرف دریا تھا، میدان جنگ کو خاردار شاخون سے استوار کیا، اور پھر ان خاردار شاخون کو مٹی کی دیوار بنا کر مستحکم کیا،[3]

اکبر کے اکتالیسوین سال جلوس مین صادق خان نے نظام الملک کے خلاف دکن مین فوج کشی کی تو جنگ دجدل کا مقام نہکر واقع دریائے بان گنگا (شاخ گوداوری) تھا، شاہی فوج نے لشکر گاہ کو اس طرح ترتیب دیا کہ سامنے دریا، اور پشت پر ایک رود بار تھا،[4]

جہانگیر کے اٹھاروین سال جلوس مین شاہی فوج گجرات مین عبد اللہ خان کے خلاف معرکہ آرا ہوئی، تو تزک جہانگیری مین ہو (ص ۳۰۳)

"از اتفاقات حسنہ جائے کہ نصرت اللہ (یعنی عبد اللہ) فرود آمدہ بود، زمین پست و بلند بود، ز قوم زار انبوہ و کوچہائے تنگ داشت بنا برین سلسلۂ افواج او انتظام شایستہ نیافت

[1] طبقات اکبری جلد دوم ص ۴۵ [2] اکبرنامہ جلد اول ص ۱۳۳ [3] ایضاً جلد سوم ص ۲۵۴ [4] ایضاً ص ۶۱۵،

شاہجہانی عہد میں دارا اور اورنگ زیب کی جنگ جانشینی کی پہلی لڑائی میں دارا کی طرف سے مہاراجہ
جسونت سنگھ نے نربدا کے ساحل پر دھرمات میں میدانِ جنگ منتخب کیا، لیکن اس کی زمین بہت ہی
تنگ پست، ناہموار اور نشیب و فراز سے پُر تھی، مہاراجہ جسونت سنگھ نے حسب معمول لشکر گاہ کے
چاروں طرف خندق بھی کھدوائی، اور میدان کی زمین کو پانی ڈال کر کیچڑ سے آلودہ کردیا، جو سواروں
کے گھوڑوں کے لئے مضر ثابت ہوا، [1]

خندق کھود کر لشکر گاہ کو محفوظ کرنے کی تدبیر آخر آخر وقت تک قائم رہی، بہادر شاہ اول
کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں جانشینی کی جنگ شروع ہوئی، تو شہزادہ عظیم الشان نے لاہور کے
پاس راوی کے ساحل پر اپنے لشکر کی قیامگاہ کو جس طرح ترتیب دیا، وہ خافی خان کے الفاظ میں
ملاحظہ ہو،

"پشت بدریائے راوی دادہ فرود آمدہ دو طرف لشکر حکم کندن خندق فرمود و طرف
دیگر لشکر عظیم الشان دریا داشت" [2]

فرخ سیر اور جہاندار شاہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوئے، تو جہاندار شاہ نے پہلے اپنے لڑکے
عزالدین کو پچاس ہزار سوار دے کر فرخ سیر کے مقابلہ کے لئے بھیجا، عزالدین کھجوہ میں اپنے لشکر کے ساتھ
قیام پذیر ہوا، لشکر کے گرد اُس نے خندق کھدوائی، جو پندرہ فٹ چوڑی اور دس فیٹ گہری تھی،
خندق کی مٹی لشکر کی طرف ڈال دی گئی، جس کی اونچائی قد آدم کے برابر تھی، اسی اونچائی پر مورچال
بنایا گیا، (تفصیل کے لئے دیکھو خافی خان جلد دوم ص ۶۹۹)

خندق کھود کر توپوں کے لئے جو مورچے تیار کئے جاتے وہ ملچار یا مورچل یا مورچال کہلاتے
تھے، گو یہ اصطلاحات قلعہ اور حصار کی جنگ کے سلسلہ میں زیادہ استعمال کی گئی ہیں، جیسا کہ آئندہ

[1] واقعات عالمگیری عاقل خان ص۳۲، لاہور اڈیشن [2] منتخب اللباب جلد سوم ص۶۸۶،

ذکر آئے گا، مگر میدانِ جنگ میں بھی زمین کھود کر توپوں کی مورچہ بندی کے لئے ملچار اور مورچل بنائے جاتے،
مثلاً شاہجہانی عہد میں شہزادہ اورنگ زیب بلخ کی مہم میں اوزبکوں سے لڑ رہا تھا، تو تیمور آباد کے پاس
اُس نے اپنے لشکر گاہ کے گرد ملچار تعمیر کئے، بادشاہ نامہ میں ہے،

"باشارۂ آن والا گوہر بر دلاوران ظفر آئین کوہ تمکین بر دو رادو ملچار ہا مقرر نمودہ و
در ہر جانب با بہادران ہنرگزین مراسم حفظ و حراست بتقدیم رسانیدہ شب گذرانیدند" [1]

دارا شکوہ اپنی جنگ جانشینی کی دوسری لڑائی کے سلسلہ میں اورنگ زیب سے لڑنے کے لئے دھولپور
پہنچا تو عاقل خان کا بیان ہے،

"و بر ساحلِ آبِ چنبل خیمہ و خرگاہ تا گنبد نیلگون برافراشت و بر مسالک و معابر
مورچال مقرر کردہ جابجا افواج و توپخانہ تعبیہ نمود از جانب دا اطراف راہ عبور بر موکب
منصور مسدود ساخت" [2]

دارا شکوہ جب دھولپور سے بڑھکر سموگڈھ میں معرکہ آرا ہوا، تو میدانِ جنگ میں اس کی فوج
کو پانی کی کمی کی وجہ سے شدید نقصان پہنچا، اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اس کے لڑکوں میں تخت و
تاج کے لئے قتال و جدال کا میدان گرم ہوا تو جاجو کی جنگ میں شہزادہ اعظم شاہ کے لشکریوں کو بھی پانی
کی قلت کے سبب بڑی صعوبت اور مصیبت اٹھانی پڑی، جاجو کا میدان اعظم شاہ کی فوج کے لئے اس
کی گرد آلود زمین کے باعث بھی نہایت مضر اور ہلاکت خیز ثابت ہوا، [3] جنگ جب انتہائی شدت کو پہنچ
گئی، تو یکایک اعظم شاہ کی مخالف سمت سے بہت تیز اور تند ہوا چلی، گرد و غبار کی کثرت سے لڑائی
کا میدان لشکریوں کی آنکھوں میں ایسا سیاہ اور تاریک ہوگیا کہ اپنے اور بیگانے کی تمیز باقی نہیں

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم ص۴۹۲ [2] واقعات عالمگیری ص۳۲ [3] منتخب اللباب جلد دوم ص۵۹۳، عہد اکبری میں شاہی
فوج جانی بیگ کے خلاف سیوان کے (ٹھٹھ) قریب جنگ کر رہی تھی، تو شاہی فوج کو گرد آلود زمین کی وجہ سے میدان
جنگ میں بہت دقتیں اٹھانی پڑیں جنگ کے درمیان تیز ہوا چلنے لگی تو از شورش باد و خاک از یک دیگر آگہی نبود (اکبر نامہ جلد سوم ص۶۰۹)

رہی، لیکن یہی ہوا، اعظم شاہ کے حریف معظم شاہ کے لئے فتح و کامرانی کی وجہ بن گئی، موخر الذکر کے لشکر سے جو تیر پھینکا جاتا وہ ہوا کی مدد سے اول الذکر کے فوجیون کے زرہ وبکتر مین تیزی سے پیوست ہو جاتا تھا، اور جو سنگ ریزے بادِ صرصر سے اڑکر اُس کے لشکر مین پہونچتے، وہ گولیون کی طرح لشکریون کے چہرون پر لگتے تھے، برخلاف اس کے اعظم شاہ کی طرف سے جو بان تیر اور گولہ پھینکا جاتا وہ مخالف ہوا کی وجہ سے یا تو چند قدم پر جاکر گر جاتا، یا پلٹ کر خود اسی کی صف مین چلا آتا تھا، (خافی خان جلد دوم ص ۵۹۴)

بہادر شاہ کی وفات کے بعد شہزادہ عظیم الشان لاہور کے پاس راوی کے کنارے جہاندار شاہ سے جنگ کر رہا تھا کہ یکایک ایک آندھی آئی اور راوی کی ریت ہوا مین بادل کی طرح چھا گئی، لشکریون کو غبار کے سوا کوئی چیز نظر نہین آرہی تھی، وہ مشکل سے اپنی آنکھین کھول سکتے تھے، وہ صرف توپون کی صدائین سن رہے تھے، اور بے حس وحرکت کھڑے تھے، اس تاریکی اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ لشکریون نے عظیم الشان کے خزانہ کو لوٹنا شروع کر دیا،[1]

مجلسِ مشاورت لڑائی شروع ہونے سے پہلے اعلیٰ فوجی عہدیدارون کی ایک مجلس مشاورت منعقد ہوتی تھی، سلاطین دہلی کے زمانہ مین اس قسم کی مجلس کے لئے امیر خسرو نے کبھی صرف "مجلس"[2] اور کبھی مجلس ملکی[3] اور عصامی نے انجمن[4] کی اصطلاح استعمال کی ہے، امیر خسرو نے اس مجلس مین شریک ہونے والون کو "رائے زنانِ لشکر" کہا ہے[5]، یہ مجلس سرلشکر کی صدارت مین منعقد ہوئی، اور فوج کے اکثر "ملوک کبار" "مردانِ رزم دکار" اور "تو یغانِ سال خوردہ" اس مین شریک ہوتے، کیونکہ مہم کی کامیابی کی ذمہ داری اُن پر بھی ہوتی تھی[6]، عارض اور ان کی عدم موجودگی مین نائب عارض اس مجلس مین ضرور شریک ہوتا[7]،

---

[1] سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۰۳ [2] تغلق نامہ ص ۸۰ [3] خزائن الفتوح ص ۴۴، [4] فتوح السلاطین ص ۴۲۵ [5] خزائن الفتوح ص ۱۲۲ [6] ایضاً ص ۱۳۵، تغلق نامہ ص ۴۸، مجلس مشاورت کی مثالون کے لئے دیکھو تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی الیٹ جلد چہارم ص ۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۸۱ وغیرہ،

اہم فیصلے غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے بعد کئے جاتے، کیونکہ اگر لشکریون کی اکثریت کو یہ یقین ہوتا کہ سرلشکر کے کسی حکم سے ان کی جانین محض تلف ہو جائین گی، تو وہ اس کے حکم کو بجالانے سے انکار کر دیتے، اس لئے آداب الحرب والشجاعہ کے مولف فخر مدبر نے لشکر کے نگہبانون کے لئے یہ ہدایت لکھی ہے کہ فوج کی کثرت اس وقت تک مفید اور موثر نہین ہو سکتی، جب تک کہ باقاعدہ مشورون سے مہم مین کافی احتیاط اختیار نہ کی جائے،[1]

تیموریون کے زمانہ مین بھی لڑائی کے موقع پر جنگی مشاورت کی خاص اہمیت تھی، امیر تیمور نے تزک تیموری مین اُن کے متعلق جو اپنے خیالات جابجا ظاہر کئے ہین، وہ ملاحظہ ہون :-

"مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ مخالفون پر غالب آنا نہ لشکر کی کثرت سے اور نہ ان سے مغلوب ہونا، فوج کی کمی سے ہوتا ہے، بلکہ غلبہ صرف تائید اور تدبیر سے حاصل ہوتا ہے،

"مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ رائے تدبیر، اور مشورہ عقلمند اور ہوشیار آدمی سے کرنا چاہئے، اگرچہ کامیابی کا راز پردۂ تقدیر مین چھپا ہوا ہے" لیکن رسول اللہ صلعم کی سنت کے موافق مین نے جو کام کیا، مشورہ سے کیا، جب اربابِ رائے واصحابِ مشورہ اکٹھا ہوئے تو برے بھلے، نفع ونقصان اور پیش آنے والے کامون کے کرنے یا نہ کرنیکے متعلق مین نے ان سے گفتگو کی، اور جب ان کی باتین سنین، تو دونون پہلوؤن پر غور کیا، اور نفع ونقصان کو سونچا، اور اس کام کے خطرات کو غور سے دیکھا، جس کام مین مجھکو دو خطرے نظر آئے، اُس کو نظر انداز کر دیا، اور جس کام مین صرف ایک خطرہ تھا، اس کو اختیار کر لیا،..........

مین نے تمام کامون مین مشورہ سے کام لیا، اور اس کام کے انجام دینے مین ہیچ تدبیر کی، اور اس کام کے پورے ہونے کی راہ پر غور کرنے کے بعد اس کام کو شروع کیا، اور "تدبیر"

---

[1] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن، اکتوبر ۱۹۳۷ء

عزم مجو، احتیاط، انجام بینی اور دور اندیشی سے اس کام کو پورا کیا، مجھ کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ صاحبِ مشورہ وہ لوگ ہو سکتے ہین، جو باتفاق اپنے قول و فعل پہ مصمم عزم کر لین، اور اس کام کو کسی وجہ سے نہ چھوڑین، اور اگر یہ کہین کہ ہم اس کام کو نہ کرین گے، تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکین"

مجھ کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ مشورہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک زبان سے، دوسرا تہِ دل سے، مین نے جو زبانی مشورہ سنا، اس کو صرف کان سے سن لیا، اور جو مشورہ تہِ دل سے سنا، اس کو کان اور دل دونون مین جگہ دی،

فوج کشی کے وقت مین نے صلح و جنگ دونون کے متعلق گفتگو کی، اور اپنے امراء کے دل کی بات کا سراغ لگایا کہ وہ جنگ چاہتے ہین، یا صلح، اور اگر انھون نے صلح کا مشورہ دیا، تو صلح کے فوائد کا مقابلہ جنگ کے نقصان سے کیا، اور انھون نے اگر جنگ کی بات چیت کی، تو اس کے فائدے پر صلح کے نقصان کے متعلق غور کیا، جس مین فائدہ زیادہ نظر آیا، اسی کو اختیار کر لیا، اور وہ مشورہ جو فوج مین نا اتفاقی پیدا کرتا تھا، اس کے سننے سے مین نے احتراز کیا، اور جس صاحبِ مشورہ نے بے اختیارانہ مشورہ دیا، اس کو سن لیا، اور جس شخص نے عاقلانہ اور مردانہ بات کی، اس کو بھی سنا،

مین نے مشورہ ہر شخص سے طلب کیا، لیکن ہر بات کی بھلائی اور برائی پر غور کیا، اور اس کے صحیح و صواب کے پہلو کو اختیار کیا،[1]

تیمور کے جانشین مذکورۂ بالا زرین مشورون سے برابر مستفید ہوتے رہے، ان کے عہد مین لڑائی کے موقع پر "مجالس کنکاش" اور انجمنون کی مثالین بکثرت ہین،[2] میدانِ جنگ مین بادشاہ کی موجودگی

[1] تزوک تیموری ص ۹، ۱۰، ۱۱، ۵، ۶، ۷ [2] تزک بابری اردو ترجمہ ص ۲۴۴، ۲۹۲، ۳۰۹، اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۰۱، ۲۰۲، ۴۸۲، ۴۸۳،

مین ایسی انجمن اور مجلس کنکاش کا انعقاد اسی کی صدارت مین ہوتا، وہ نہ ہوتا تو صدارت کے فرائض سپہ سالار انجام دیتا، اور اس مین امرائے ذوی الاقتدار[1]، "اہلِ[2] اعتبار"[3]، "خبرت گویان"[4]، "کارآگاہان"[5]، "سرانِ لشکر" یعنی قشون اور تومان کے سردار وغیرہ شریک ہوتے، اس انجمن مشاورت مین خوب مباحثے ہوتے، اور ہر ایک فرد آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا، ضرورت کے وقت یہ انجمن لڑائی کے دوران مین بھی منعقد کی جاتی، اس وقت اجتماع شاہی تور کے نیچے ہوتا، مباحثے مین زیادہ تر برزو آزمائی حملہ آوری اور صف شکنی کے قواعد و ضوابط اور دغا و بجا کے رسوم و آداب پر گفتگو ہوتی،[6]

مجلس مشورت مین پرجوش تقریرین

اس مجلس اور انجمن مین بعض اوقات ولولہ انگیز تقریرون سے لشکر کے سردارون اور عہدیدارون مین غیر معمولی جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، بعض مثالین ملاحظہ ہون،

علاء الدین خلجی کی فوج کیلی مین مغلون کے مدمقابل ہوئی، تو ظفر خان نے فوجی سردارون کی ایک انجمن منعقد کی، اور ان کو مخاطب کر کے کہا، اے سرانِ سپاہ! میدانِ جنگ مین کون سی تدبیر اختیار کرنی چاہیئے، اگر ہم ان کفار سے جان بچا کر فرار ہو جائین، تو ہم اپنے سلطان کو کیا منہ دکھائین گے، اور اگر ہم لڑنے کو آمادہ ہو جائین، تو دس ہزار فوج کے مقابلہ مین ہمارے پاس ایک ہزار فوج ہے، ہم عجیب کشمکش مین ہین، دو بھیڑیون کے درمیان ایک بھیڑ آ گئی ہے، نہ پیچھے ہٹنے اور نہ لڑائی لڑنے مین چین ہے، لیکن مین وہی کرون گا، جو اس مجلس مین آزمودہ کار اصحاب مجھکو کرنے کو کہین گے،

فتوح السلاطین مین اس تقریر کو اس طرح منظوم کیا گیا ہے،

[1] طبقات اکبری جلد سوم [2] تا [5] اکبر نامہ جلد سوم ص ۸۸۱ [6] ملفوظات تیموری ایلیٹ جلد سوم ص ۴۲۲-۴۲۹ ذکاء اللہ جلد سوم ص ۲۷، ۲۶۹،

بدیشان بگفت اے سران سپاہ　　چہ تدبیر باید درین حرب گاہ

ازین فوج کافر اگر بگذریم　　چہ روبیش صفدار عالم بریم

درآید ونک پچیم در کارزار　　کجا یک ہزار و کجا دہ ہزار

عجب کار مارا بہ پیش آمدہ است　　دو گرگ از پس و پیش پیش آمدہ است

در عطف خیرے نہ در کارزار　　کنیم انچہ گویند مردان کار

اس تقریر کو سُن کر اصحاب انجمن نے کہا اے خان! مغلوں کو پسپا کرنے مین تمھاری شہرت بہت ہی دور تک پھیل چکی ہے، اس لئے اگر تم لڑائی کئے بغیر سلطان کے پاس گئے، تو تمھاری شان مین کمی نہ ہوگی، اور سلطان تم سے ناخوش نہ ہوگا،

گروہے ز اصحاب آن انجمن　　بگفتند کاے خانِ فرخندہ فن

شکستی سراسر مغل را سپاہ　　زماہی رسید این خبر تا بہ ماہ

کنون عطف شایانِ تر از کارزار　　کہ شہ را براہت دو چشم است چار

ظفر خان شجاعت، بہادری اور معرکہ آرائی کے لئے اپنے زمانہ مین بہت مشہور ہوچکا تھا اُس نے بزدلی اور کم ہمتی سے میدان جنگ چھوڑ کر واپس جانے مین ذلت اور خواری محسوس کی، اس کو اپنے فوجی سرداروں کا جواب پسند نہین آیا،

چو زان قوم بشنید خان این سخن　　خروشید و جوشید چون اہرمن

ظفر خان نے اُن کو مخاطب کرکے پھر کہا جب ایک دن مرنا ہے تو دشمنون پر حملہ کرکے مرنا بہتر ہے، مین تو اس ہندوستان مین نامورون کی موت مرون گا، اور آج ہی کی لڑائی مین جان دون گا، تاکہ میرا نام تاریخون مین زندہ رہے، جو شخص اس نازک موقع پر میدان جنگ مین وفادار رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ تو فوجون کے ساتھ آگے بڑھے، تاکہ مہر و وفا کی کتاب مین اس کا نام باقی رہے، اور

جو مراجعت چاہتے ہین، وہ واپس ہوجائین، اُن کے ہاتھ پاؤن بندھے ہوئے نہین ہین، وہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے محفوظ مقام پر پہنچ جائین، فتوح السلاطین کے مصنف کی زبانی بھی اس تقریر کو ملاحظہ فرمائیے[۱]

بگفتا کہ اے قوم آشفتہ رائے　　نداند فرقے ز سر تا بپائے

ہمہ حال چون جان بباید سپرد　　بباید نمودن یکے دست برد

من امروز آید چو نام آوران　　کنم ختم در ملک ہندوستان

وہم جنگیے اید کہ در روزگار　　بماند بشہنامہا یادگار

کرا زے کہ با ما درین وقت تنگ　　وفائے نماید ہنگامِ جنگ

ہموست ہمراہ اہلِ غزا　　بود نقش نامش بہ مہر و وفا

گروہے کہ دارند بر عطف رائے　　نہ بستہ است شان را کسے دست و پائے

سپہ تا نکو داست بر جنگ ساز　　سلامت ہمین دم بگردند باز

ظفر خان کی تقریر سن کر تمام فوجی سردار بے حد متاثر ہوئے، یکزبان ہوکر بولے کہ ہم جان دینے اور آگ مین کود پڑنے کے لئے بھی تیار ہین،

کہ تا جان بود جان سپاری کنیم　　بہ پشت سر خود بخاک افگنیم

بفرمان خان جملہ راضی شویم　　اگر خان فرستد در آتش رویم[۱]

غازی ملک (یعنی غیاث الدین تغلق) جب خسرو خان کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دہلی کی طرف بڑھا، تو خسرو خان نے پیشقدمی کرکے سرستی کے پاس اس کو روکنا چاہا، خسرو خان کے پاس کثیر فوج تھی، لیکن غازی ملک نے اپنی پریشانی اور سراسیمگی کا اظہار نہین کیا، بلکہ اپنے لشکر کے سردارون کو بلا کر ایک پرجوش تقریر کی، جس کو امیر خسرو نے تغلق نامہ مین اس طرح منظوم کیا ہے،

---

[۱] فتوح السلاطین ص ۲۵۵،

ملک در پیش یک یک را طلب کرد پس از دل قصه را همان لب کرد

که ما را چرخ پیشین آورد کارے که گردش هست در وی چرخ وارے

گرانبروے پیل است و دل شیر که هم بازو شود با ما به شمشیر

نخست از خون خود خیزد چو لاله پس از خون عدو شوید پیاله

ته خنجر نهد اول سر خویش کشد پس بر دگر سر خنجر خویش

یلے مردان بهر سازے و سوزے کسان را پرورند از بهر روزے

بود هر روز عشرت را شمارے فتد او بعد عمرے کارزارے

بکارے ناید ار یارے دران روز بسوزش دل که نبود یار دلسوز

بود تیر از براے رزم نخچیر تو بے آن چوبه دان چو به تیر

کمان گر بشکند هنگام پیکار زهے کے یابد از لب های سوفار

اگر شاهین زبون گردد ز شارک کله گل مرغ را زیبد نه تارک

بیاید آن که دارد کار با ما شوید از عهد و پیمان یار با ما

شود گر عهد ها محکم به سوگند بکار جان شویم از جان کمر بند

دگر یارے ندارد میل یاری که دشوار است کار جان سپاری

درین یاری که دارد کار با من دل من هست آخر یار با من

بدین دل کاهنین سندیست آیا کنم گر سد آهن باشد از جائے

مرا یاور بس است و هم ترازو دو بازوے من و توئید بازو

شنیدم بود رستم چیره دستے که گاه حمله تنها صف شکستے

نه آن رستم ز من درکار بیش است که هر کس رستمے در عهد خویش است

چو من بر نام یزدان تکیه کردم یقین است آن که تنها چیره گردم

مراد من چو جز دین را فرج نیست من و این کار بر غیرے حرج نیست

اس تقریر سے جو اثر پیدا ہوا، وہ بھی سننے کے لائق ہے۔

چو بشنیدند مردان سرافراز ز مخدوم خود این حرف سرانداز

سراسر چون همه سرباز بودند بروے خاک سرها باز بردند

پس آنگاه از سراسر بازی خویش سر خود خدمتے بردند در پیش

فرو گفتند کاے سرور سران را بزیر پاے تو سر سروران را

همیشه باد سر بار کلاهت کله گوشه کشیده سر بماهت

سرے کز دولتت عمری کله داشت ز کارت چون توان اکنون نگه داشت

بسر بازی چو ما را فرده دادی سر ما در کله ناید ز شادی

نه ما آن سرسری آریم پیشت که ندهیم ار فتد سرهاے خویشت

چه باشد یک سر ما زیر خنجر هزاران پاره گردد جمله یک سر

ز هر پاره جدا برخیزد آواز که باز از بهر تو کردیم سرباز

کمر بستیم و پیمان نیز بستیم بر آن پیمان رگ جان نیز بستیم

که تا جان در تن است سر بگردن نخواهیم از درت سر دور کردن

چو ما را سر جدا گشت اندرین کار تو دانی خواه صلح و خواه پیکار[1]

بابر رانا سانگا سے جنگ کرنے کو کنواہا کے میدان کی طرف بڑھا، تو اُس نے اپنے فوجی امراء در

[1] تغلق نامہ ص ۸۴ - ۸۵ - ۸۶ - اسی جنگ میں ایک اور موقع پر غیاث الدین تغلق نے ایک تقریر کی تھی جو تغلق نامہ ص ۲۰ پر درج ہے،

سردارون مین سراسیمگی، بزدلی اور کم ہمتی کے آثار دیکھے، لیکن اس نازک موقع پر اس نے غیر معمولی ہوشمندی سے کام لیا، اپنے ہمراہیون مین شجاعت و بہادری اور جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک مجلس کنکاش منعقد کی، اور فوجی عہدہ دارون کے سامنے حسب ذیل تقریر کی،

"اے امرا اور سردارانِ فوج!

هر که آمد بجهان اهلِ فنا خواهد بود | آنکه پاینده و باقی است خدا خواهد بود

جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا، جو دنیا مین آیا ہے وہ یہان سے جائیگا بھی، بدنام ہو کر جینے سے نیک نام ہو کر مرنا بہتر ہے،

بنام نکو گر بمیرم رواست | مرا نام باید که تن مرگ راست

جانتے ہو کہ یہان سے ہم لوگون کا وطن اور شہر کتنی دور ہے؟ کئی مہینون کا راستہ ہے، خدا وہ دن نہ دکھلائے کہ ہم کو شکست ہو جائے، اور اگر ہم کو شکست ہو گئی (نعوذ باللہ) تو پھر ہم کہان کے رہین گے؟ کہان ہمارا وطن؟ کہان ہمارا شہر؟ ہم اجنبیون اور بیگانون کے ساتھ پڑے ہون گے، جانتے ہو اگر ہم کو شکست ہو گئی، تو مسلمان بادشاہ جو دنیا کے ہر گوشہ مین موجود ہین کیا کہین گے، اور ہم کو کس زبان سے یاد کرین گے، اہلِ دنیا کی گفتگو اور طعن و ملامت کو چھوڑ دو، قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مین کیا عذر پیش کر سکون گا کہ ایک سلطنت مسلمان بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گئی ہے، اس سلطنت کا بادشاہ اپنے بہت سے ہم مذہبون اور ہم قوم کو قتل کر کے بن بیٹھا تھا اور آج غیر مسلمون سے جنگ کئے بغیر، کم از کم بغیر عذر شرعی کے واپسی کا راستہ تلاش کرون؟ آخر ان کے ہاتھون اس ملک کے باشندون پر کیا کیا مصیبتین نہ آئین گی، افسوس اب وہ وقت ہے کہ دل مین شہادت کی ٹھان کر جہاد کے لئے بڑھین،

چون جان آخر از تن ضرورت رود | همان به که باری بعزت رود
سرانجام گیتی همین است و بس | که نامی به نیکی بماند ز پس

اللہ تعالٰی نے ہم کو یہ سعادت عطا کی ہے، اور یہ دولت عنایت فرمائی ہے کہ اگر ہم غنیم پر غالب آئے، تو غازی کہلائے، اور اگر مرے تو شہید ہوئے، دونون حال مین ہم کو بڑا اجر اور بلند مرتبہ ملتا ہے، آؤ ہم سب مل کر حلف اٹھائین کہ ہم موت سے نہ بھاگین گے، اور جب تک دم مین دم ہے، اس لڑائی سے منہ نہ پھیرین گے، [لہ]

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ سردارون، نوکرون، چھوٹون اور بڑون نے کلام پاک کو ہاتھون مین لے کر قسمین کھائین کہ وہ میدانِ جنگ سے کسی حال مین بھی منہ نہ موڑین گے، چنانچہ لڑائی ہوئی تو ان کو فتح و نصرت حاصل ہوئی،

شیر شاہ ہمایون کے خلاف قنوج مین معرکہ آرا ہوا، تو جنگ سے پہلے اُس نے اپنے لشکریون کو اس طرح مخاطب کیا:

"مین نے بہت سعی کر کے تم کو جمع کیا ہے، اور تمھاری تربیت مین حتی المقدور کوتاہی نہین کی، آج ہی کے دن کے لئے تمھاری نگاہداشت کی ہے، آج ہی امتحان کا روز ہے، آج ہی کے دن جو میدانِ حرب مین غالب ہوگا، اپنا رتبہ بڑھائے گا، ایسی کوشش کرو کہ وقت کارزار مین سب افغان یک دل و یک زبان ہون، افغانون کی فوج مین اتفاق ہو تو شمشیر زنی مین کوئی ان کے برابر نہین، مین اپنے عزیزون سے یہ التماس کرتا ہون کہ حسد، خصومت اور اختلاف کو جانے دو، سلطان ابراہیم کے عہد مین یہ حسد، مخاصمت اور

[لہ] یہ تقریر بابرنامہ اردو ترجمہ (ص ۳۰۹-۳۱۰) ہمایون نامہ از گلبدن بیگم (ص ۱۶) اور طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۶ کے مختلف ٹکڑون کو ملا کر تیار کی گئی ہے،

اختلافات ہی کی وجہ سے افغان مغلوب ہوئے، جس کا مزہ انھون نے خوب چکھا، لشکر کی فیروزمندی اور بلندی اس کی یکدلی سے حاصل ہوتی ہے، اے عزیزو! تم کو یہ معلوم رہے کہ مین نے عزم جزم کرلیا ہو کہ اس رزم گاہ سے اس وقت زندہ نکلون گا کہ فتح و نصرت ہو، ورنہ میرا سر دشمنون کے گھوڑون کے سُم سے کچلا نظر آئے گا، مرنا مسلّم ہے، بہتر ہے کہ ایسے کام مین مرین کہ نیک نام ہون، اے عزیزو دم ڈرو نہین، رزم گاہ مین اس طرح جاؤ کہ سر کے ساتھ پاسبانی کلاہ رکھو، سپاہ کے لئے اس سے زیادہ کوئی بدنامی، اور شرمندگی نہین ہو کہ اس کا آقا مارا جائے، اور سپاہی اور خدمت گار زندہ رہین، اس جنگ مین ثبات قدم کے لئے تحریض کرتا ہون، کیونکہ ملک ہند کا ہاتھ آنا، اور مغلون کے ہاتھ سے اہل و عیال کا رہائی پانا اسی پر موقوف ہی، مین بڈھا ہوگیا ہون، ہزارون دقتون سے افغانون کو جمع کیا ہے، اگر خدانخواستہ اس معرکہ مین یہ لشکر شکست کھاکر پراگندہ ہوگیا، تو پھر اس کا دوبارہ جمع ہونا محال ہے، ہوا سے جو کلیان درخت سے جھڑجاتی ہین، پھر وہ شاخون پر جمع نہین ہوتین"

اس تقریر کو سن کر افغانون نے پامردی اور جان نثاری دکھانے کا وعدہ کیا[۵۱]

۱۸ جلوس شاہی مین اکبر نے دوسری بار احمد آباد مین محمد حسین مرزا کے خلاف اپنی فوج صف آرا کی تو لڑائی شروع ہونے سے پہلے اس نے اپنی فوج کی ہمت ان الفاظ سے بڑھائی،

"غنیم کی تعداد بظاہر بہت ہی لیکن درگاہ الٰہی کے اس نیازمند کی طرف خداوند کا سا

[۵۱] تاریخ شیر شاہی مؤلفہ عباس خان سروانی بحوالہ ذکاء اللہ، جلد سوم ص ۳ - ۲، ۳، و الیٹ جلد چہارم ص ۱، ۴۔ مجلس مشاورت مین شیر شاہ کی اور تقریرون کے لئے دیکھو الیٹ جلد چہارم ص ۴، ۷، ۳، ۴، ۳۔۴ و ذکاء اللہ جلد سوم ص ۲۹۲،

کی عنایت اس سے بھی زیادہ ہے، جتنی کہ انسانی عقل کے احاطہ مین آسکتی ہے، تمھارا طریقہ یہ ہو کہ تم اپنے کو عاطفت ربانی کی مضبوط رسّی مین جکڑ لو، تذبذب اور تزلزل کے شائبہ کو دل مین مطلق نہ لاؤ یک دل، یک رو، اور ایک راہ ہو کر اپنی پراگندگی کو اپنے سے دور رکھو، غنیم کی فوج کا جھنڈا سُرخ ہے، ان کے سر پر خون سوار ہے، تم نصرت کے ہمرکاب ہوکر اُن کے پاس پہنچ جاؤ، میدان جنگ مین بہادرون کو جوش مین لڑائی اور تجربے کے مسلک سے باہر نہین ہونا چاہئے، اور جب ہم اس سرکش کا کام تمام کرلین گے، تو دوسرے بدبختون سے چھٹکارا پالین گے"[۵۲]

۱۰۳۵ھ مین جہانگیر کشمیر سے کابل جارہا تھا، تو دریائے جہلم کو عبور کرتے وقت مہابت خان نے سازش کرکے جہانگیر کو اپنی حراست مین لے لیا، نور جہان بھی ساتھ تھی، جہانگیر کا قید ہونا تھا کہ شاہی فوج مین انتشار پھیل گیا، لیکن نور جہان اپنی فراست اور تدبیر سے کام لے کر مہابت خان کے پنجہ سے بچ نکلی، اور دریا کی طرف اپنے بھائی آصف خان سے جا ملی، وہان پہنچ کر ارکان دولت کو طلب کیا، اور نہایت ہی خشمگین ہوکر اُن کے سامنے ایک ملامت آمیز تقریر کی کہ

"تمھاری غفلت اور ناتجربہ کاری سے ایسی بات پیش آئی، جو کسی کے تخیل مین بھی نہین آسکتی تھی، تم اب خدا اور خدا کی مخلوق کے سامنے شرمندہ ہو، لیکن یہ شرمندگی اس وقت دور ہوسکتی ہے، کہ جو کچھ ہوچکا ہی اس کا تدارک ہونا چاہئے، بتاؤ اب کیا کرنا ہی"

اس ملامت بھری تقریر کو سن کر نور جہان کے ہمراہیون نے بالاتفاق مہابت خان کی فوجون پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا[۵۳]

سموگڑھ مین دارا اور اورنگ زیب کی فوجون کا اجتماع ہوا، تو لڑائی سے ایک رات پہلے

[۵۲] اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۵ [۵۳] اقبالنامہ جہانگیری ص ۲۶

اورنگ زیب اپنے لشکر کے "مبارزان نصرت کیش" اور "دلیران صف شکن" میں یہ کہکر جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا،

"کل بہادری اور مردانگی دکھانے کا دن ہے، اس جگہ سے ہمارا پایۂ تخت بہت دور ہے، یک دل اور یک رو ہو کر دشمنوں پر حملہ کرو، اور اپنی چمکتی ہوئی تلواروں کی ضرب سے حکومت حاصل کرو، فتح پاکر، اور دشمنوں کو پسپا کرکے دنیا میں نام پیدا کرو،

بکوشید کوشیدن مرد وار | رگ جان بکوشش کنید استوار
اگر دست بردیم ما راست ملک | وگر ماشدیم آن وا راست ملک[۱]

کھجوہ کی جنگ میں جسونت سنگھ کی سرداری میں راجپوت سپاہی آئین وفا کے خلاف اورنگزیب کو چھوڑ کر شجاع سے جاملے، جسونت سنگھ کے ہاتھ میں اورنگ زیب کی فوج کی میمن یعنی دائیں بازو کی کمان تھی، اُس نے لڑائی سے ایک رات پہلے شجاع سے سازش کرلی کہ رات کو میں عقب سے اورنگ زیب کی فوج پر حملہ آور ہوں گا، اور تم سامنے سے حملہ کر دینا، اس طرح ہم دونوں مل کر اورنگزیب کو پیس ڈالیں گے، چنانچہ جس وقت اورنگ زیب کو جسونت کی بے وفائی کی خبر ملی تو اس وقت وہ تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا، اس کی فوج میں انتشار پھیلا، لیکن اس کی پیشانی پر بل نہ آیا، اس نے اطمینان کے ساتھ تہجد کی نماز ختم کی، پھر ضبط و ہمت اور وقار و تحمل کا پیکر بن کر تخت رواں پر سوار ہوا، اور اپنے امراء اور ہمرکابوں کو جمع کرکے اُن سے اس طرح مخاطب ہوا،

"الحمد للہ، اس واقعہ سے منافقوں اور دوستوں کی تفریق ہوگئی، اور اس کو میں مدد الٰہی سمجھتا ہوں، اور اب یہی چیز میرے لئے فتح و کامرانی کی باعث ہوگی، بعض کوتہ اندیش، اور باطن منافقوں کو یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ اب غنیم کا غلبہ ضروری ہے، اور اسی لئے وہ

---

[۱] واقعات عالمگیری ص ۴۴،

دشمنوں سے جاملے ہیں، لیکن وہ اپنے اعمال اور خیال خام کی سزا پائینگے[۲]"

اس تقریر سے اورنگ زیب کے لشکر میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی، اور اپنے آقا کا سکون اور اطمینان کلی دیکھکر اسکو ڈھارس ہوئی، تقریر کے بعد اورنگ زیب نے نقارہ بجانے کا حکم دیا، اور اپنی سواری کا ہاتھی منگوایا، تمام رات اسی ہاتھی پر سوار ہو کر اپنی فوجوں کی نگرانی کرتا رہا، آفتاب طلوع ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھی شجاع کے ہاتھی کی طرف بڑھایا جائے، مرشد قلی خان نے روکا کہ اتنی جرات بادشاہوں کے دستور کے خلاف ہے، لیکن اورنگ زیب نے کہا کہ

"کوئی شخص یونہی بادشاہ نہیں ہوجاتا، اسی قسم کی جرأت سے بادشاہت ملتی ہے، اگر بادشاہت ملنے کے بعد جرأت میں کوئی فرق آجائے تو سلطنت باقی نہیں رہ سکتی،

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لب شمشیر آب دار دہد[۳]

(باقی)

---

[۲] عالمگیر نامہ ص ۵۶-۲۵۵ ، خافی خان جلد دوم ص ۵۳ [۳] احکام عالمگیری بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر معارف پریس ص ۷۰،

مقدمۂ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء، اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و واقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے، قیمت: صر

"منیجر"

"اخلاقِ ہندی"

کا

ایک نادر اڈیشن اور پامر کا اردو قصیدہ

از

جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

میر بہادر علی حسینی مصنف اخلاق ہندی نثر بے نظیر تاریخ آسام اور رسالہ گل گرائسٹ کے حالات میں صرف اتنا معلوم ہے، کہ میر بہادر علی حسینی کا شمار مرحوم فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز ارباب قلم میں ہوتا تھا، اور ڈاکٹر گل گرائسٹ، جان شکسپیر اور ڈاکٹر فوربس جیسے محبانِ اردو کی سرپرستی میں کالج کے منشیوں نے سادہ اور بے تصنع اردو نثر لکھنے کی جو مہم شروع کی تھی، ان میں میر بہادر علی بھی ایک نمایاں مقام رکھتے تھے، ان کے متعلق جو کچھ بھی منتشر مواد مل سکا، اسے "صاحب ارباب نثر اردو" نے ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ یکجا کر دیا ہے؛[1]

میر بہادر علی کی کتابوں کو وہ شہرت اور وہ حسن قبول حاصل نہ ہو سکا جو اُن کے ہمعصر اور ہم پیشہ میر امن کی لکھی ہوئی کتابوں کو حاصل ہوا، ان کی تصانیف میں تاریخ آسام اور رسالہ گل گرائسٹ، تو اب تک شائع بھی نہیں ہوئیں، اور ہنوز مخطوطوں کی شکل میں پڑی ہوئی ہیں، تاہم ان کی کتابوں میں "اخلاق ہندی" کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ "باغ و بہار" "طوطا کہانی" اور "بیتال پچیسی" جیسی کتابوں کو

---

[1] ارباب نثر اردو، از سید محمد طبع دوم ۱۹۳۷ء ص ۱۱۰-۱۱۲

چھوڑ کر فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں کی کم کتابوں کو نصیب ہوا؛ اخلاق ہندی بہادر علی حسینی کا مشہور کارنامہ ہے، اور بقول صاحب ارباب نثر اردو حقیقت میں ان کا نام بھی نثر بے نظیر اور اخلاق ہندی ہی سے زندہ ہے؛[1]

جیسا کہ خود مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں بتایا ہے کہ یہ کتاب اُس نے ڈاکٹر گل گرائسٹ کی فرمایش پر ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں لکھی، پہلی مرتبہ اس کا ایک طویل اقتباس گل گرائسٹ کی بیاض ہندی میں شائع ہوا، اور اسی سال یعنی ۱۸۰۳ء میں خود گل گرائسٹ نے اپنی نگرانی میں پوری کتاب کلکتہ سے شائع کی؛ اس کے بعد یہ کتاب متعدد بار چھپی چنانچہ سر جارج گریرسن نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا میں اس کے مختلف اڈیشنوں کی جو فہرست دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچاس سال کے عرصہ میں یہ کتاب بمبئی، بنگلور، کلکتہ اور لندن میں چھپتی رہی، اور اس عرصہ میں اس کے دس بارہ اڈیشن نکل گئے، اس کے بعد اس کے اور بھی اڈیشن نکلے، لیکن اس کے باوجود اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں، اول تو ان دنوں ایسی قدیم اور پارینہ کی حیثیت رکھنے والی کتابوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، اور دوسرے یہ کہ یہ کتاب ایسی دائمی مقبولیت نہیں حاصل کر سکی جیسی کہ باغ و بہار کو نصیب ہوئی،[2]

صاحب ارباب نثر اردو کے پیش نظر اخلاق ہندی کا جو نسخہ تھا، وہ مطبع فتح الکریم بمبئی کا چھپا ہوا تھا، انھوں نے لندن کا چھپا ہوا نسخہ نہیں دیکھا، لکھتے ہیں ۱۸۶۶ء میں ایک صاحب سید عبد اللہ نامی نے اس کا نفیس اڈیشن نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا، اس میں تمہید اور حاشیہ بھی تھا،[3] یوں بھی اس کتاب کے نسخے کمیاب ہیں، یہ اڈیشن تو نایاب کا حکم رکھتا ہے؛ راقم کی نظر سے یہ نسخہ گذرا ہے؛ اور بعض ایسی خصوصیتوں کا حامل ہے جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں، اس لئے اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے؛ کتاب متن اور مرتب کے لکھے ہوئے خاتمہ کو ملا کر رائل سائز کے (۱۹۲) صفحوں پر ٹائپ میں چھپی ہے؛

---

[1] ارباب نثر اردو، از سید محمد طبع دوم ۱۹۳۷ء ص ۱۱۶ [2] ایضاً ص ۱۱۲ [3] ایضاً ص ۱۱۱،

آخر میں آٹھ صفحون میں مرتب کا انگریزی مقدمہ اور (۳۳) صفحون میں حواشی آئے ہیں، سرورق کی عبارت ہی،

"اخلاق ہندی جس کی اصل مفتی تاج الدین کی مفرح القلوب فارسی ہے، اور میر بہادر علی حسینی نے زبان ہندستانی میں اس کا ترجمہ کیا اور وہ ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ کے شہر کلکتہ میں چھاپا ہوا تھا، اب بعہد مہد ملکہ معظمہ انگلستان و ہندوستان کوئین وکٹوریہ دامت سلطنتہا بوزارت آنریبل سر اسٹافورڈ نارتھکوٹ بیرونٹ ممبر آف پارلیمنٹ سکرٹیری آف اسٹیٹ فار انڈیا بہ تصحیح خاکسار بے مقدار سید عبد اللہ بن سید محمد خان بہادر غفران پناہ مطبع صاحبان ذی شان ڈبلیو ایچ ایلن اور کمپنی واقع نمبر ۱۳ واٹرلو پلیس ویسٹ منسٹر لندن میں پھر مطبوع ہوا، ۱۸۶۸ء عیسوی، مطابق ۱۲۸۵ھ ہجری،

کتاب کے آخر میں تقریباً اسی مفہوم کا سرورق انگریزی میں ہی"

اس کتاب کے مرتب سید عبد اللہ کے تفصیلی حالات کی راقم نے بڑی تلاش و جستجو کی لیکن افسوس ہو کہ کامیابی نہیں ہوئی، کتاب کے مقدمہ یا خاتمے سے بھی ان کی زندگی کے حالات پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی، بہر حال جو کچھ بھی معلوم ہو سکا وہ یہ ہو کہ ان کا تعلق اودھ کے ایک اونچے گھرانے سے تھا، وہ نقوی سید تھے، لیکن زمانہ کے انقلاب کا شکار ہو کر یہ خاندان پراگندہ ہو گیا، ان کے والد سید محمد خان جائس کے باشندے اور مشہور آدمی تھے، انھون نے اس کتاب کی اشاعت کے سال یعنی ۱۸۶۸ء میں وفات پائی تھی، سید عبد اللہ نے کتاب کے آخر میں جو قصیدہ اس وقت کے وزیر ہند سر اسٹافورڈ نارتھ کوٹ کی مدح میں لکھا ہو اس میں اپنے بارے میں کہتے ہیں،

انکشاف نام کی خواہش اگر بندے کو ہو	انکسار و عجز سے دیتا ہون مین اپنا نشان
سید عبد اللہ نقوی نام اس عاجز کا ہو	نام نامی باپ کا میرے ہے مشہور جہان
حضرت سید محمد خان بہادر جائسی	صاحب اعزاز و مکنت افتخار خاندان

ہین اما م عاشران کے جد امجد فخر خلق	کون بہتر اُن سے ہوگا اور دالا دودمان
رحمت اللہ ان پر ہووے تا روز قیام	جو ہوئے اس سال ہی داخل باغ جنان

صاحب تذکرہ ہندو یوروپی شعرائے اردو و فارسی رام بابو سکسینہ کے بیان کے مطابق سید عبد اللہ اودھ کے نواب سید رجب علی خان ارسطو جاہ بہادر کے شاگرد تھے، اور ان سے لاہور، دہلی اور جگراؤن میں تعلیم حاصل کی تھی، اور ارسطو جاہ ہی نے سید عبد اللہ کو بمبئی کے گورنر سر جارج کلارک کی خدمت میں پیش کیا تھا، اونھون نے کوشش کر کے سید عبد اللہ کو جامعۂ کیمبرج میں مشرقی زبانون کا استاد مقرر کرا دیا تھا، وہ اردو، عربی، اور فارسی کے سوا ہندستان کی اور کئی زبانیں جانتے تھے، چنانچہ جامعہ کیمبرج میں اردو عربی اور فارسی کے علاوہ ہندی، بنگالی اور گجراتی بھی پڑھایا کرتے تھے،

معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں جامعہ کیمبرج میں اور بھی کئی ہندوستانی عالم جمع ہو گئے تھے، ان میں اودھ کے نواب اقبال الدولہ خاص طور سے مشرقی علوم کی ترویج میں پیش پیش تھے، ایک اور صاحب کا نام سید عبد اللہ نے اس کتاب میں ضمناً لیا ہے، یہ مدرسہ عالیہ ٹرنٹی کالج ڈبلن کے مدرس اولاد علی ہیں، غالباً یہ وہی صاحب ہیں، جو پامر کے پاس مصرع طرح بھیجا کرتے تھے، ان کا نام سکسینہ صاحب کی کتاب میں آیا ہے، ان کا حسب ذیل شعر بھی سید عبد اللہ نے نقل کیا ہی،

سواد موئے سیہ یون ہر رخ کے پرتو پر	دھوئیں کی جیسے سیاہی ہو آگ کی لو پر

سید عبد اللہ نے اخلاق ہندی کی طرح سنگھاسن بتیسی کو بھی مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کر کے انگلستان سے شائع کیا تھا، یہ کتاب اخلاق ہندی سے پہلے شائع ہوئی تھی، اخلاق ہندی کے اس نسخے کی طرح سنگھاسن بتیسی کا یہ نسخہ بھی نایاب ہے، راقم کی نظر سے یہ کتاب نہیں گذری، البتہ اس کا اشتہار ڈاکٹر فوربس کی مرتبہ کتاب منتخبات عربی (Arabic Reading. London. 1864) کی پشت پر دیکھا ہے،

سید عبد اللہ اس وقت کے وزیر ہند سر اسٹافورڈ نارتھ کوٹ سے شخصی طور پر متعارف تھے، اور ان کی اجازت سے اپنی کتاب انھون نے ان کے نام معنون کی ہے اور تمہیدے مین، اور کتاب کے مقدمہ اور خاتمہ مین بالکل مشرقی انداز مین اُن کی بڑی تعریف کی ہے، اور ان کا شکریہ ادا کیا ہی،

سرورق کے بعد قواعد ضروری کے عنوان کے تحت کتاب مین جو اعراب دیئے گئے مین، ان کی تشریح درج ہے، ملاحظہ ہو،

"قواعد ضروری جو اس کتاب مین ملحوظ ہین،

واؤ معروف، جیسا تُو، دُوسرا، مارون گا، بے نشان ہے،

ی معروف، جیسے پانی، موتی، گھی، بھی، بے علامت،

واؤ مجہول، مثل تو، کو، سوچ، جزم مدوّر، کا نشان رکھتا ہے، تاکہ فرق رہے، اور کوئی تُو بروزن ’رو‘ یعنی چہرہ کو، تو، جو وزن بر دو کے ہے، نہ پڑھے،

ی مجہول متوسط ہو تو یہی نشان رکھتی ہے، مگر آخر لفظ مین بدون کسی نشان کے بڑی "ے" لکھی گئی، جیسے بیٹے، میرے،

واوٗ ما قبل مفتوح پر نشان ۂ کا دیا کہ واؤ مجہول سے مشابہ نہ ہو، اور معروف سے تمثیل نہ ہے، جیسا نوٗ۔ دوٗلت،

ی ما قبل مفتوح پر متوسط ہو، یا آخر یہی نشان ۂ ہے، مگر فرق کے لئے ھی کے تلے زیر د سے دیا ہے،

نونِ غنہ یا نونِ خفی، آخر مین بے نقطہ چھوڑا، مثلاً مین نہین کو مین نہین لکھا، درمیان مین جابجا اس پر جزم ۂ دے دیا ہے، جیسے ہنسی منھ نون اظہار کو حالت اصلی پر رکھا ہے، جیسے منجن، انجن، تین،

میرے عزیز دلی مولوی معنوی میر اولاد علی صاحب دام لطفہ مدرّس بمدرسہ عالیہ ٹریننگ کالج ڈبلن کا ایک مطلع ہے، اور اس مین حسن اتفاق سے مضامین قواعد مذکورہ کی اکٹھی ہوگئی ہین، اس واسطے یہان حسب موقع لکھا جاتا، دو گو ہذا،

شعر

سواد موے سیہ یون ہی رُخ کے پرتو پر ڈھونڈنگی جیسے سیاہی ہو آگ کی لو پر

اسی صفحے کے مقابل (یعنی سرورق کی پشت پر) یہی "قواعد ضروری" انگریزی مین ادا کئے گئے ہین اس کے بعد پانچ صفحون پر کتاب کے مطالب کی فہرست اردو مین "فہرست اخلاق ہندی کی" اور انگریزی مین انڈکس کے عنوان کے تحت کالمون مین دی ہے،

فہرست کے اختتام پر اصل کتاب شروع ہو جاتی ہے، اب کتاب کو بند کرکے داہنی طرف سے شروع کیجئے تو پہلے انگریزی مین سرورق ہے جیسے ہم اوپر نقل کر آئے ہین، اس کے بعد انگریزی مین رائٹ آنریبل سر اسٹفورڈ . ج نارتھ کوٹ سکریٹری آف اسٹیٹ آف انڈیا کے نام تمہید ہے، "اسی کے ساتھ ایک خط ہے، جس مین موصوف کی ہندوستان کی زبان سے دلچسپی کا شکریہ ادا کیا گیا ہے،

اس کے بعد انگریزی مین آٹھ صفحون پر پھیلا ہوا مرتب کا مقدمہ ہے، ابتدا مین اخلاق ہندی سے متعلق وہی باتین بیان کی ہین، جن کا تذکرہ ہم اوپر کر آئے ہین، اس کے بعد اردو یا ہندستانی کے متعلق یہی دعوی کیا تھا جس کی صداقت کو آج ایک صدی کے بعد بھی ہر محبِ وطن پوری طرح محسوس کر رہا ہے، لکھتے ہین :۔

"اخلاق ہندی کی زبان خالص ہندوستانی ہے، جو پورے جزیرہ نما کی قومی زبان ہے اور جس کو راس کماری سے کابل تک تقریباً ہر شخص بولتا ہے"

اس کے بعد افسوس کا اظہار کیا ہے کہ حکومت ہندوستانیون کو انگریزی سکھانے کے لئے تو دے

صرف کرکے لائق اور فاضل استادوں کو بھیجنے کا انتظام کرتی ہے، لیکن انگریزوں کو ہندوستانی سکھانے کے لئے ایسا ہی طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا، انگریزوں کو اردو پڑھانے والے جو اشخاص مل جاتے ہیں وہ نہ تو باقاعدہ تربیت یافتہ ہوتے ہیں، اور نہ ان کی علمی استعداد ہی کچھ اچھی ہوتی ہے، اس کے بعد ایسے انگریزوں کو جو ہندوستان میں قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں، صحیح ہندوستانی سیکھنے کے بارے میں کئی مشورے دیئے ہیں، اسی کے ذیل میں رومن رسم خط اختیار کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں،

جو لوگ ہندوستان میں قیام کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے ہندوستانی زبان کی اہمیت ظاہر ہے، اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لئے بیجا نہ ہوگا، اگر کچھ ایسے مشورے پیش کئے جائیں، جو اس زبان کے سیکھنے میں بہترین ثابت ہوں، ایک جندی کو اس کے حروف تہجی خود سیکھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اگر زبان پر خراب قسم کا تلفظ چڑھ گیا، تو پھر اس کو درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے ایک تجربہ کار استاد کی نگرانی میں یہ زبان سیکھنی چاہئے، اسی کے ساتھ نستعلیق کی مشق شروع کر دینی چاہئے، جیسا کہ فارسی کی ہندوستانی گرامر میں دی ہوئی ہے، بعض کوتاہ اندیش رومن رسم الخط اختیار کرنے کی رائے دیتے ہیں، اور اسی رسم الخط میں ابتدائی کتابیں پڑھنے کو کہتے ہیں، لیکن یہ محض کاہلی کا ایک کل بہانہ ہے، کیونکہ کوئی شخص کسی کی زبان کو اس وقت تک نہیں سیکھ سکتا ہے، جب تک کہ رسم الخط سے بھی واقف نہ ہو جس میں یہ زبان لکھی جاتی ہے؛

مقدمہ کا خاتمہ مسٹر پامر کی ایک عربی نظم اور اس کے انگریزی ترجمہ پر کیا ہے، جس کا تفصیلی ذکر ہم آگے کریں گے۔ مقدمہ کے بعد انگریزی میں حواشی درج ہیں، جو (۲۴) صفحات پر محتوی ہیں، حواشی میں سب سے پہلے کتاب کے ابتدائی حصہ یعنی حمد و نعت و سبب تالیف کا انگریزی ترجمہ درج ہے، اس کے بعد کتاب میں جہاں جہاں عربی الفاظ، مشکل روزمرہ، محاورے، اور اشعار آئے ہیں، ان پر مفصل حواشی لکھے ہیں

صفحہ ۲۰۸ پر اخلاقِ ہندی کا متن ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مرتب نے ایک خاتمہ لکھا ہے جس میں ان کا اور ان کے شاگرد ہنری پامر کا اردو قصیدہ بھی شامل ہے، اور پھر اس خاتمہ کا پورا انگریزی ترجمہ حواشی کے خاتمہ پر دیا ہے، اس ترجمہ کی ابتدا میں یہ معذرت ہے کہ ترجمہ میں اصل زبان کی لذت و چاشنی نہیں ہیگی، یہ خاتمہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے اس لئے اسے شروع سے آخر تک نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے،

خاتمہ | ہو الاول، ہو الآخر، الحمد للہ کہ اس کتاب کا اختتام ہوا، اور عہد وزارت امیر کبیر سر اسٹافورڈ نارتھ کوٹ صاحب بہادر بالقابہ میں یہ نسخہ تمام ہوا، اور ان کی توجہ بے غایت اور الطاف و عنایت سے نہ فقط اس کتاب کا بلکہ خود اس فدویت انتساب کا رتبہ بڑھا، بقول سعدی

سزد گر بدورش بنازم چنان	کہ سید بدورانِ نوشیروان

اوصاف اس مجمع علم و کمال اور مرکز جاہ و جلال کے میری کیا جان اور قلم کی کیا زبان ہے، جو بیان کروں، اس کی ذات خجستہ صفات فضل حی و قیوم سے موجود ہے، میرا تعریف کرنا فضول اور بے سود ہے، مشک آنست کہ از خود بوید نہ آنکہ عطار گوید، عیان راچہ بیان، اگر چہ ازحق ہو اس کو چھپانا گویا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے، اور اپنے ولی نعمت کا شکر نہ کرنا کفر ہے، من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ اس واسطے بالکل ساکت بھی نہیں رہ سکتا،

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا	چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل، بہر حال الفاظ چند بطور اظہار حق، نہ خوشامد سے عرض کرتا ہوں ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

حقیقت حال یہ ہے کہ جس تاریخ سے یہ امیر ابن امیر مدبر امور ہند مقرر ہوا، ہر طرح سے خیال بہبود ہند اور ہندیوں کا مد نظر رہا، افضال الٰہی اور اقبال شاہی اور اس وزیر خوش تدبیر کی نیک نگاہی سے سارا ہندوستان آباد ہے، اور ہر دل انصاف پسند شاد ہے،

یہ سچ ہے کہ اقلیم ہندوستان — ہوئی اس کی اقبال سے بوستان
شگفتہ ہین گل بلبلین نغمہ سنج — شکستہ ہین سب خار اندوہ و رنج

ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستان مین کوئی مسافر ایک شہر سے دوسرے شہر کو بے خطر نہ جا سکتا تھا، راہین ٹھگون اور ڈکیتیون سے، بازار دغابازون اور جیب کترون سے، دوکانین اور گھر نقب زنون اور چورون سے حفاظت مین نہ تھین، اور ایک وقت یہ ہے کہ حکومت سرکار مین راہین خشکی اور تری کی، ریل گاڑی اور دودکش کی آمد و رفت سے پرشور و غوغا ہین، مال تجارت کروڑون کا آتا جاتا ہے، کوئی نہین پوچھتا کہ موتی لئے جاتے ہو یا پرت، سونا لادا ہے، یا پتھر، بازارون مین جتنی مال و اسباب کی کثرت ہے، اتنی ہی کیسہ برون کی قلت، دوکانون اور گھرون مین کچھ چوکی پہرے کی حاجت نہین، ڈپٹی کلکٹری ان کا پاسبان ہے، جہان لڑائی اور خونریزی کا ہر روز سننے مین آتی تھی، وہان اب سنسان ہے، ہر روز علم کی ترقی اور جہل کی کمی ہے، انصاف سے ظلم کی خرابی اور برہمی ہے، جہان گائے بیل کی قربانی منع اور آدمی کی اذن مباحات تھی، بچہ کشی اور ستی ہونا گویا منہ کی بات تھی، وہان مارپیٹ کا تو کیا ذکر ہے کوئی کسی کو گالی بھی اگر دے یا آدمی کے بدلے جانور کی جان ناحق کو لے تو ایسی سزا پائے کہ چھٹی کا دودھ زبان پر آئے، بردہ فروشی اور کسب حرام گمنام، حفاظت رعایا کو تھانے اور پولیس، حفاظت ملک کو فوج جرار پیادہ اور سوار بری اور بحری ہمیشہ تیار، مخالف سرکاری زبون اور نشان جہازات عالم کے سامنے رایت دولت انگلیزیہ کے سرنگون ہوتے ہین، یہ عزت کیا کم ہے، کہ حکومت ملکہ معظمہ کی سرکوب عالم ہے، پھر وزیر ایسے بادشاہ ظفر پناہ کا کیونکر دیوانہ ہو، شعر

وزیرے چنین شہریارے چنان
جہان چون نہ گیرد قرارے چنان

ہند پر شکریہ اس کا فرض ہے کہ زیر حکومت ایسے بادشاہ معدلت پناہ کے ہین جس کا وزیر

آصف جاہ و سلیمان سے عقل اور تدبیر مین بڑھ کر ہے، میرے اوصاف اس حکومت کے اگر کوئی شخص خوشامد پر محمول کرے، تو اس کو لازم ہے کہ احوال ہند کو ایک نظر بچشم انصاف دیکھے، مدرسے، تھانے، نمائش گاہین، دواخانے، تار برقی، ڈاک، مراکب دودی (یہ ترجمہ ہو Steamers کا)، ترقی تجارت، دادرسی مظلومان، سرکوبی ظالمان، رئیس بے انتظام کو معزول کرنا، اور حاکم منتظم کو اختیار دینا، یہ سب باتین رفاہ کی میرے دعوی پر دلیل ہون گی، اور مخالف کی دلیلین سب ذلیل ہون گی، انصاف شرط ہے، جو حصہ ہندوستان کا ابھی سرکار نے نہین لیا، دیکھو تو وہان کیسی خرابی اور ویرانی ہے، حاکم وہان کے تھپنے کے تھپنا، گوبرگنیش، ماٹی کے طبیب (ان محاورون کا انگریزی ترجمہ کیا ہے Blockheads. pampered. drivellers) جو الف کا نام لٹھا بھی نہین جانتے، رات دن رنڈیون مین بسر کرتے ہین،

صبح تو جام سے گذرتی ہے — شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گذرتی ہے

ان کا وجود کالعدم ہے، چہ خفتہ چہ بیدار،

مگر سب حکام اور راجہ ایسے نہین، جناب معزز خطاب، مہاراجہ سرکیاتی والی پٹیالہ کو دیکھئے کہ اپنے حسن انتظام اور عقل و فہم سے کتنے نیک نام رہے، اور بیشگاہ ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ دام ملکہا سے تمغاے عزت اور خطاب فرزند خاص منصور زمان، امیر الامراء، مہاراجہ، دھراجہ، راجیشر، مہاراجہ راجگان، نرندر سنگھ بہادر کا ملا، اور اب فی زماننا سری مہاراجہ ادھیراج والی کپورتھلہ دام دولتہ، جو سرکار انگریزی کے خیرخواہ جانی رہے، اور جانفشانی مین جان و مال سے دریغ نہین کیا، اور مہمات کابل اور پنجاب مین کیسے کارہاے نمایان کئے، خصوصاً بلواے ۱۸۵۷ء مین جو شجاعتین اور بہادریان کین ان کا کیا کہنا، یہی کافی ہے کہ بہ جلدوی حسن خدمات بیشگاہ حضرت ملکہ معظمہ سے خطاب فرزند دلبند راسخ الاعتقاد، راجہ رندھیر سنگھ بہادر اور ستارۂ ہند کا تمغا عطا ہوا، جاگیر بھی ملی، اور تنبیہ

وی ہے کہ اور ترقی مناصب بھی ہو، یہ سب خوبیان ان کے حسن انتظام اور کالٹر کی قدر شناسی کا ثمرہ ہی، تعریف دولت انگریزی کی کرنا گویا توصیف ارکانِ دولت کی ہے، اگر وزراے حکومت کے ایسے نہ ہوتے، تو یہ رونق سلطنت کہان ہوتی؟ اگر رایٹ آنریبل سر اسٹافورڈ نارتھ کوٹ صاحب بہادر دوام اقبالہٗ کی نیک نیتی، خوش نصیبی اور تدبیر رسا شریک نہ ہوتی، تو یہ نیک نامی جو فتح حبش پر ان کی وزارت کے ایام مین حاصل ہوئی، کب ہوتی؟ کیا اعانت ربانی ہے کہ جتنا کام ان کے تحت مین ہے، سب زیب حسن انتظام و کامرانی ہے، جس قدر اس امیر کبیر کے اوصاف بیان کرون، تھوڑے ہین، اس نیازمند کو خود ان کی خدمت مین نیاز ہے، اس لئے جو کہتا ہون آنکھون دیکھی ہے، فقط کانون سنی نہین، جو خوبیان اس مختصر مین اس عالی ہمت والا دودمان مجمع علم منبع فیض، معدن جود و احسان کی لکھون وہ اس سے بہت کم ہون گی، جو تاریخ عالم مین ابدالآباد کو نام پر میرے ممدوح کے لکھی جائین گی مین فقط دعا پر اپنا کلام تمام کرون گا، کیونکہ اس کے اوصاف کرنا اور دریا کو کوزے مین بھرنا میرا کام نہین، جو کچھ مین نے کہا ہے، اندکے از بسیارے و مشتے نمونہ از خروارے ہے،

تا زیب زبان بود تقریر — تا زینت کاغذ است تحریر

نامت ببود بہ نیک نامی — ہر خامہ کند تر اعلامی

سرچشمۂ فیض تو روان باد — اقبال و جود و دولت جوان باد"

اس کے بعد انگریزی مین قصیدہ ہو، اس مین یہ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، کہ قصیدہ مین جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، ان مین بظاہر غلو معلوم ہو گا، لیکن مین نے ان کو شکر اور صداقت کے جذبے مین قلمبند کیا ہے،

قصیدہ

گو نہین حاصل بخوبی قوتِ نطق و بیان — پر مناسب ہو کہ ہون حمد خدا سے تر زبان

وہ خداے پاک و برتر جس نے احمد کو کیا — وہ نماے جن و انسان پیشواے مرسلان

وہ نبی جس نے علی کو جانشین اپنا کیا — جانتے ہین سب غدیر خم کے جو ہین رازدان

دونون کو پہنچے درود اور دونون کو پہنچے سلام — اُن کے لائق اور کیا ہے پاس میرے ارمغان

شکرِ خالق مین رہے مصروف خلقت چاہیے — یعنی بندون پر ہے وہ اپنی نہایت مہربان

سلطنت وکٹوریہ کو کی عطا اللہ نے — ہندیون پر ہے یہ احسانِ خداوندِ جہان

کوئی ایسی کوئی گذری ہے نہ آگے ہوئیگی — فیض بخش و دادگستر اہلِ جود و امتنان

ختم اس پر ہے رعیت پروری و منصفی — ہے عجب عاجز نواز اہلِ عطا و مہربان

خلق و اکرام و مروت مین نہین اس کا نظیر — قدر اس کی جانتے ہین خوب جو ہین قدردان

پیر گردون خم بہ تسلیم ہے اس کے حضور — عقل و بخت اس کو دیئے ہین حق تعالیٰ نے جوان

بے سخن وہ باعثِ افزونیٔ اخلاق ہے — کیون فدا اس پر نہ کیجئے اے دل اپنا مال و جان

حکم اس کا ماہ سے ماہی تلک جاری ہوا — کیون نہ ہو توصیف مین اسکے مرا خامہ روان

اس کے حق مین کر رہے ہین اوج و حشمت کی دعا — ساکنِ انگلینڈ و ہر باشندۂ ہندوستان

ہون عدو پامالِ غم آفاق مین اسکے مدام — دوست جو دل سے ہون اسکے وہ رہین شب شادمان

کیسے کیسے اہلِ دانش ہین امیر اسکے رفیق — ہے بجا اک اک کو گر کہئے فلاطونِ زمان

انتظامِ مملکت کرتے ہین باآئین بہین — بندوبست ان کا ہے بیشک باعثِ امن و امان

منتخب ان مین سے ہے ممدوح میرا نارتھ کورٹ — رائٹ آنریبل سر اسٹافورڈ مشہورِ جہان

وہ مدارِ کارِ عالم مستقل ذی اختیار — راتق و فاتق وہی ہے از پئے ہندوستان

اسکے اوصافِ حمیدہ سے ہے خوش وکٹوریا — والیٔ روے زمین شاہنشۂ ہندوستان

بادشاہ کوئی نہ ویسا ہے نہ ایسا ہے وزیر — دونون کو رکھے سلامت خالقِ کون و مکان

کس قدر اخلاق نے پایا ہی عالم مین رواج   کبر و نخوت کا نہین باقی رہا نام و نشان

علم اخلاق و ادب مین ہے بے نظیر و بے مثال   مفتی تاج الدین کا اک نسخہ ہی مشہور جہان

بارہ سو اٹھارہ ہجری مین ہوا تصنیف جو   تھے اٹھارہ سو اور تین از سن عیسائیان

ترجمہ اردو زبان مین کیا اک شخص نے   رکھ دیا اخلاق ہندی نام جو کر شادمان

اسم سامی مترجم ہے بہادر سے شروع   خاتمہ ہے نام کا اس کے علی پر بے گمان

تھی کتاب خوب و زیبا بس کہ علم خلق مین   اور سکھلاتی تھی ہر اک کو زبانِ ہندیان

صاحبانِ عقل و دانش کو خوش آئی اس قدر   کر دیا مشروط اس کو از برائے امتحان

مین نے جب اس پر نظر کی خوب غور و فکر سے   بیشتر اغلاط پائین دیکھین کم تر خوبیان

جس قدر ممکن ہوا مین نے کمال جہد سے   صرف ہمت کو کیا بہر سرور دوستان

بعد تصحیح مزید آخر اسے چھپوا دیا   دیکھ کر تا اہل دانش اسکو ہون سب شادمان

ختم طبع اس کا ہوا مطبع مین بالطف تمام   ڈبلیو۔ آیچ ایلن اینڈ کو جو فرمانی ہین یہان

سیزدہ نمبر کے ساکن ہین بہ واٹرلو پلیس   خاص لندن مین جو زینت بخش ہی بحر روان

ہوا اگر ادراک سال طبع مطبوع مزاج   ہوئے گا اس بیت کے پڑھنے سے ہر اک کو عیان

یک ہزار و ہشت صد و شصت و ہشت عیسوی (۱۸۶۸)   یک ہزار و دو صد و ہشتاد و پنج مسلمان (۱۲۸۵ھ)

باوجود اہتمام صحت و فور بلیغ   کچھ بھی گر سہو و خطا کا ناظرین پاوین نشان

لطف و الطاف بزرگانہ سے یہ امید ہو   دامنِ عفو و عطا مین اس کو فرمائین نہان

انکشافِ نام کی خواہش اگر بندہ کے ہو   انکسار و عجز سے دیتا ہون مین اپنا نشان

سید عبد اللہ ہندی نام اس عاجز کا ہی   نام نامی باپ کا میرے ہی مشہور جہان

حضرت سید محمد خان بہادر جائسی   صاحبِ اعزاز و مکنت افتخار خاندان

ہین امام عاشران کے جد امجد فخر خلق   کون بہتر ان سے ہوگا اور والا دودمان

رحمت اللہ ان پر ہوئے تا روز قیام   جو ہوئے اس سال ہی داخل باغ جنان

یہان مرتب کتاب سید عبد اللہ کا قصیدہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد ایک انگریزی عبارت درج ہے، جس مین مرتب کے دوست اور شاگرد مسٹر ای، ایچ پامر فیلو سنٹ جانس کالج کیمبرج کے ایک قصیدہ کی تعریف کی گئی ہے، اس مین مسٹر پامر کے قصیدہ کے صحیح اسلوب بیان اور اظہار تخیل کی بڑی داد ہے،

اڈورڈ ہنری پامر، جن کا قصیدہ ہم آگے نقل کرین گے، وہی مشہور انگریزی مستشرق ہین، جنھون نے قرآن کا انگریزی مین ترجمہ کیا تھا، ان کا ذکر مقدمہ مین بھی آچکا ہے، ایسے انگریز جنھون نے اپنی ذاتی محنت اور شوق سے صحیح اردو کی تحصیل کی ہے، ان کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہین،

"ہندوستان تقریبًا دو صدیون سے انگلستان کے قبضہ مین ہے، لیکن ایسی کوئی مثال نہین کہ ہندوستان کی کسی زبان مین کسی انگریز نے انگریزی کی کوئی کتاب ترجمہ کی ہو، بعض ہندوستانی کتابون کا ترجمہ یا بعض کو ایڈٹ کرکے انگلستان مین چھاپا گیا ہے، جو بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے، لیکن اگر ہندوستان کے نوجوانون کے لئے سائنس اور تعلیم کی بعض کتابین ترجمہ کی جاتین، تو یہ اور بھی بہتر ہوتا، اہل یورپ جن مین محنت و استقلال زیادہ ہوتا ہی، اچھے اساتذہ کی نگرانی مین اپنے کو اس کام کے لایق بنا سکتے ہین، مثالاً مین ایک ایسا نام پیش کرتا ہون جس نے مشرقی زبانون مین پوری مہارت حاصل کر لی ہے، یہ میرے دوست اور شاگرد مسٹر ای۔ ایچ پامر فیلو سنٹ جانس کالج کیمبرج ہین، جنھون نے عربی، فارسی اور اردو کے اخبارون مین اپنی نثر و نظم کو شائع کرکے ان زبانون کے ماہرین کو حیرت مین ڈال دیا ہے، ان کی تحریرین صحیح

اسلوب بیان اور آسان اور بامحاورہ انشا کے حیرت انگیز نمونے ہین، اور یہ اور بھی زیادہ تعجب انگیز ہے کہ انھون نے کبھی ہندوستان کا سفر بھی نہین کیا ہے"،

پھر اسی مقدمہ کے آخر مین مسٹر پامر کا ایک انگریزی قصیدہ نقل کیا ہے، جو انھون نے رائٹ آنریبل سر اسٹفورڈ نارتھ کوٹ کی شان مین کہا تھا، اسٹیفورڈ کے نام سے اخلاق ہندی معنون کی گئی ہی، اس لئے اس قصیدہ کے آخری شعر مین اخلاق ہندی کی اشاعت کی تاریخ بھی درج ہی،

فی ظل استفورد مجد ذی العلی   وزیرنا الاعظم باهی الغوت

وصاحب الفتح الذی لم یزل   مؤیدا من ربه الصباوت

ألغالب الدیبا بسا داتها   رأیا وتدبیرا وعز ما ثبوت

محیی دروس العلوم فی عصره   فی کل قوم قد عراهم حفوت

طباعة الکتب باسعافه   من بعض آثاره لا تموت

اخلاق هند طبعه للملاء   بهیبج استفورد نورته کرت

۲۰ ۷۶۱ ۶۶۱ ۴۲۴

۱۸۶۰ء

اس کے بعد اس عربی نظم کا انگریزی نثر اور نظم دونون مین ترجمہ دیا ہے،

(باقی)

تاریخ اخلاق اسلام

اس مین اسلامی تاریخ کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کی اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے، مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی،

ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت ؏

"منیجر"

جلوۂ صدرنگ

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب ایڈوکیٹ اعظم گڈھ

اس نام سے جناب حبیب احمد صدیقی ام اے ال ال بی کلکٹر بلیا نے اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے، شروع مین مصنف کے ایک مختصر دیباچہ کے بعد جناب مجنون گورکھپوری کا تحریر کردہ پیش لفظ ہے، جس سے مصنف کے ذاتی اخلاق، علمی و ادبی قابلیت اور خصوصیات شاعری پر کافی روشنی پڑتی ہے، کلام کا بیشتر حصہ غزلون پر مشتمل ہے، آخر مین چند مختصر نظمین بھی ہین، جن سے صدیقی صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے،

صدیقی صاحب کی خوش مذاقی اور لطافت طبع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ انھون نے غزل کو جو سب سے زیادہ لطیف اور نازک صنف شاعری ہے، اپنا موضوع سخن قرار دیا ہے، اور اس مین شبہہ نہین کہ وہ اس میدان مین عام غزل گو شعراء کے مقابلہ مین مختلف حیثیتون سے کامیاب اور ممتاز نظر آتے ہین،

غزل کا اصلی موضوع عشق و محبت ہی، جو فطرت انسانی کا سب سے زیادہ لطیف، نازک، بلند اور شریفانہ جذبہ ہے، یہ وہی درد ہے جس کو نکتہ دان روم نے طبیب روحانی کہکر پکارا تھا،

شاد باش اے عشق خوش سودای ما   اے طبیب جملہ علتہای ما

یہ وہی بادہ تند و تلخ ہے، جس کے فیضان سرمد سے متاثر ہوکر حافظ شیراز نے حیات ابدی کا غلغلہ بلند کیا تھا،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یہ وہی اکسیر ہے جس کے فیض تاثیر نے تیغری کے ظلمت کدۂ کفر کو ایمان کا جلوہ گاہ و جمال بنا دیا تھا،

نیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد کفر آوردم و در عشقِ تو ایمان کردم

اس بنا پر مین اس عام خیال سے متفق نہین، کہ غزل گوئی نہایت آسان چیز ہے، اگر لکھنؤ کے عامیانہ انداز سخن کو تغزل کا معیار قرار دیا جائے، تو بے شبہہ ہر بوالہوس غزل گوئی کا دعوی کر سکتا ہے لیکن اگر غزل دراصل عشق و محبت کے حقائق و اسرار کی مصوری کا نام ہے، تو ہمارے نزدیک اس سے زیادہ دشوار اور دقت طلب اور کوئی صنف شاعری نہین ہے، اس کے لئے نہ صرف نکتہ سنج دماغ بلکہ ایک قابل دل بھی درکار ہے، لیکن یہ متاع گران ارزہر شخص کو نصیب نہین ہوتی، یہی وجہ ہے کہ جب نااہل طبیعتین اس میدان مین قدم رکھتی ہین، تو چونکہ نظر مین وسعت نہین ہوتی، اور دل درد سے خالی ہوتا ہے، اس لئے ان کی جولانگاہِ شوق صرف شاہدانِ بازاری کے لب بام تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ جذبات کی پستی اور خیالات کا ابتذال ہے،

غرض غزل ایک ایسی لطیف اور نازک صنف شاعری ہے، جس مین کسی قسم کا لفظی یا معنوی ابتذال برداشت نہین کیا جا سکتا، چنانچہ سب سے پہلے مین نے اسی نقطہ نظر سے صدیقی صاحب کے اس مجموعۂ کلام کو دیکھا، لیکن مجکو خیالات یا انداز بیان مین وہ نفرت انگیز ابتذال کہین نظر نہین آیا، جس کا دوسرا نام لکھنویت ہے، ہمارے نزدیک صدیقی صاحب کے کلام کی سب سے زیادہ نمایان اور قابلِ قدر خصوصیت یہی ہے کہ وہ حسن و عشق دونون کے عظمت شناس ہین، اس لئے اُن کے جذبات مین عام طور پر شستگی، لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی ہے، اس کا اندازہ مثالون سے ہو سکتا ہے،

محبت ہی حقیقی منزل ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب گمراہی ہے،

محبت کے سوا جادہ نہ منزل محبت کے سوا سب گمرہی ہے

محبت سراپا نیاز و بندگی کا نام ہے، اس مین شکایت کی گنجایش نہین،

محبت مین شکایت کیا گلہ کیا محبت بندگی ہی بندگی ہے

ارباب خرد کے نزدیک طریق عشق گمراہی سہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ منزلِ حیات کی حقیقی راہ نما یہی گمراہی ہے،

طریق عشق پہ ہنستی تو ہو خرد لیکن یہ گمرہی کہین منزل سے ہمکنار نہ ہو

عقل و ہوش کے آداب و قیود سے نہین، بلکہ دل ہی کی کجروی و ناعاقبت اندیشی سے زندگی وابستہ ہے،

قیود ہی قیود ہین حواس و عقل و ہوش کے یہ کجروی دل نہ ہو تو زندگی محال ہو

بغیر عشق کی نادانیون کے زندگی ایک عذاب ہے،

اک مستقل عذاب ہے پھر تو یہ زندگی الفت مین دل اگر دلِ نادان نہ ہو سکا

یہ محض شاعرانہ تخیل نہین ہے، بلکہ ایک لطیف حقیقت ہے، یعنی زندگی کی چہل پہل، رنگینی اور دل آویزی دلِ نادان ہی کی بدولت ہے، کیونکہ وہ محبت کے نور یقین سے معمور ہے، اور صرف نور یقین ہی مین قلب و روح کو حقیقی سکون و مسرت کا جلوہ نظر آ سکتا ہے، عقل کو اپنی جدت طرازیون اور موشگافیون پر کسی قدر ناز ہو، لیکن حیاتِ انسانی کو رنگین و پر کیف بنانے کے لئے اس کے پاس کوئی سامان نہین، صدیقی صاحب نے نہایت سچ کہا ہے،

جہانِ آب و گل کو جس نے ذوقِ زندگی بخشا اسے اے حضرتِ ناصح دلِ ناداں بھی کہتے ہین

لیکن افسوس ہے کہ عام غزل گو شعراء "دلِ نادان" کی حقیقی قدر و عظمت کا احساس نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سرچشمہ کیف و نشاط ایک مستقل مریض بن کر رہ گیا، اور عشق کے درد و غم کا باقاعدہ نوحہ گرون کی طرح ماتم کیا جانے لگا، حالانکہ یہی وہ نشتر ہے جس کے زخمہائے خونچکان مین تسکین روحانی

کا راز پنہاں ہے، اور تشنگانِ ذوق کو ہمیشہ اسی جرعۂ تلخ کی آرزو رہتی ہے کہ بغیر اس کے زندگی کی روح بیدار نہیں ہو سکتی، اگر عشق کے درد و غم میں کوئی مخصوص لذت نہیں ہے تو پھر خواجہ فریدالدین عطار کی یہ بے تابانہ آرزو

کفر کافر را و دین دیندار را
ذرۂ دردے دلِ عطار را

بالکل فضول اور بے سود تھی، اگر عشق کے درد و غم کا اثر بجائے سرور و انبساط کے حزن و افسردگی، رنج و ملال، گریہ و زاری، دل شکنی وغیرہ ہے، تو پھر مولانا جامی کی یہ صدائے دعوت،

اسیرِ عشق شو کآزاد باشی
غمش بر سینہ نہ تا شاد باشی

ایک بے معنی اور بے حقیقت آواز تھی،

ہم کو نہایت مسرت ہے کہ صدیقی صاحب کا مذاقِ سلیم درد و غم کی لذت سے نا آشنا نہیں ہے، انھوں نے درد و غم کو نوحہ گروں کی آنکھوں سے نہیں، بلکہ ایک بلند حوصلہ عاشق کی نگاہ سے دیکھا ہے، اس لئے اُن کے ترانہ ہائے محبت نوحہ گری کی آلائش سے پاک ہیں، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے اور سچ کہا ہے،

مجھ کو دماغِ شیون و آہ و فغاں نہیں
اک آتشِ خموش ہوں جس میں دھواں نہیں

غم سے عام طور پر نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن صدیقی صاحب اس راز سے واقف ہیں کہ یہی دراصل زندگی کا سہارا ہے، اس لئے وہ اس کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں،

دامنِ غم بھی کہیں چھوٹ نہ جائے ہمدم
زندگی کے لئے پھر کوئی سہارا ہی نہیں

صرف یہی نہیں بلکہ صدیقی صاحب کے نزدیک دردِ محبت ہی کائناتِ عالم کی روح ہے،

روحِ جہاں کرشمۂ قدرت کہیں جسے
شاید وہی ہے دردِ محبت کہیں جسے

ناکامیوں پر آنسو بہانا غم کی بہت بڑی توہین ہے،

پلکوں پہ اشک آئے تو توقیرِ غم کہاں
ناکامیوں کو پردۂ اخفا بھی چاہئے

یہ اسی جذبۂ احترام کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ عام غزل گو شعرا نے تغزل کی بزمِ سرور کو مستقل

مجلسِ عزا بنا دیا ہے،

صدیقی صاحب کے دل کو غم سے جو شغف اور وارفتگی ہے، اس نے اُن کو فکرِ مآل سے بے نیاز کر دیا ہے،

مآل دیکھئے ہو کیا، کسی کا غم ہے جزوِ جاں
کسی کا غم ہو جزوِ جاں تو پھر غمِ مآل کیا

یہ صدائے مستانہ صرف ایک بلند حوصلہ اور عالی نظر عاشق ہی کے درد آشنا دل سے اٹھ سکتی ہے، عام غزل گو شعرا نے عشق و محبت کی جو تصویر پیش کی ہے، اس میں بجز ایک رسوائے سربازار کی عامیانہ اور مبتذل اداؤں کے روحانی لطافت و بلندی کا کوئی جلوہ نظر نہیں آتا، لیکن صدیقی صاحب کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں عشق کی اخلاقی و روحانی عظمت کا کافی احساس موجود ہے، ان کے نزدیک عقل نہیں، بلکہ عشق ہی رزمگاہِ حیات کا اصلی حریف ہے، وہ عقل کی طرح زندگی کی سخت گیریوں سے لرزہ براندام نہیں ہوتا، اس کے اندر عزم و استقلال کی وہ روح پنہاں ہے جس کی قوتِ عمل راہِ طلب کے سخت سے سخت مقام پر بھی عجز و درماندگی کی کیفیت محسوس نہیں کرتی، اس کی فطرت بیم و خوف سے قطعاً نا آشنا ہے، اس کی زبان سے بزدلی کا کوئی کلمہ بلند نہیں ہو سکتا،

خرد تو زندگی کی سخت گیری سے ہراساں ہے
زبانِ عشق پر آیا نہ لفظ الاماں اب تک

اہلِ ہوس کو تو عشق کی زندگی ایک مصیبت نظر آتی ہے لیکن صدیقی صاحب کی نکتہ سنج نگاہ میں وہ سراپا عبادت ہے، جو ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی، اس کے لئے جوہرِ قابل درکار ہے،

ہر کس نہیں ہے اہل کہ سب کو عطا کریں
یہ زندگیِ عشق عبادت کہیں جسے

صدیقی صاحب نے اس شعر میں ایک لطیف اور ناقابلِ انکار حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، عبادت کا اصل مقصد محض ظاہری تقدس نہیں، بلکہ قلب و روح کو تمام رذائلِ اخلاق مثلاً بغض، حسد، کینہ، خود پرستی غرور وغیرہ کی آلائشوں سے پاک کرنا ہے، چنانچہ حضراتِ صوفیہ تزکیۂ نفس کے لئے سب سے پہلے عشق و محبت ہی کی تعلیم دیتے ہیں کہ یہ صیقل ہر قسم کے زنگ کو مٹا کر طبیعت میں خشوع و خضوع، سوز و گداز اور ذوق و شوق

کی وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جس کے بغیر عبادت کا حقیقی لطف حاصل نہین ہو سکتا، اس بنا پر اگر صدیقی صاحب کی چشم بصیرت کو عشق و محبت کی زندگی مین عبادت نظر آتی ہے، تو کچھ محل تعجب نہین، اور نہ اس حقیقت کے اعتراف سے کسی صاحبِ نظر کو گریز ہو سکتا ہے،

موجودہ دور مین مادہ پرستون کے نزدیک تو عشق و محبت کے لطیف احساسات کی کوئی وقعت نہین، عقل و ہنر نے مادی اختراعات و ایجادات کا جو حیرت انگیز منظر پیش کیا ہے، اسی کو وہ زندگی کے بام ترقی کا آخری زینہ سمجھتے ہین لیکن ہم کو مسرت ہے کہ صدیقی صاحب اس فریب مین مبتلا نہین ہین، ان کے نزدیک محبت تکمیل زندگی کے لئے لازمی ہے، اس لئے کہ وہ حسن اخلاق کا سرچشمہ ہے، اور حسنِ اخلاق ہی انسان کا حقیقی طغرائے امتیاز ہے، اسی کی بدولت اس کو کائنات ارضی کی فرمانروائی کا منصب عظیم عطا ہوا ہے، محبت کی اس شانِ عظمت کا اعتراف ان سادہ الفاظ مین کیا ہے،

وہ سادہ دل ہون کہ تکمیل زندگی کیلئے　　سمجھ رہا ہون محبت کو لازمی اب تک

افسوس ہے کہ ذوق محبت کے ایسے سادہ دل قدر شناسون کی تعداد روز بروز گھٹتی جاتی ہے ورنہ انسانی زندگی اس قدر بے کیف افسردہ اور غمناک نظر نہ آتی،

صدیقی صاحب کے نزدیک محبت ہی وہ نسخہ ہے، جس کے استعمال سے زندگی کی کلفتون مین ایک خاص راحت محسوس ہونے لگتی ہے،

اب کلفتِ حیات بھی راحت سی ہو گئی　　شاید مجھے کسی سے محبت سی ہو گئی

آگے چل کر ان کے درد آشنا دل سے یہ صدائے شکر اٹھتی ہے،

تیرا کرم کہ درد محبت عطا کیا　　آلام زندگی سے فراغت سی ہو گئی

غور کرو لفظ "سی" نے پیرایۂ بیان مین کس قدر دلکشی اور لطافت پیدا کر دی ہے؟ صحیح الفاظ کا انتخاب بھی شاعر کا ایک بڑا کمال ہے،

جس کے دل کو درد مین آرام محسوس نہ ہو، صدیقی صاحب اس کو محبت کی حقیقت سے بے خبر سمجھتے ہین،

جو درد مین راحت پا نہ سکے الفت کی حقیقت کیا جانے　　پروانہ صفت جو جل نہ سکے سرشاری الفت کیا جانے

مین نے طوالت کے لحاظ سے صرف چند مثالون پر اکتفا کیا ہے، لیکن ناظرین بخوبی اندازہ کر سکتے ہین کہ صدیقی صاحب کے دل مین محبت کے درد و غم کا جو احساس ہے وہ کس حد تک لطیف پر کیف اور پاکیزہ ہے،

اب دیکھنا یہ ہے کہ صدیقی صاحب کی چشم و نگاہ مین محبوب کی اداؤن کا کیا عالم ہے، یعنی وہ محض ایک شاہد لب بام کی جو ہوس پرور عشوہ طرازیان ہین، یا ان مین قلب و روح کے اندرونی احساسات کو شگفتہ اور مشتعل کرنے کی کوئی صلاحیت بھی ہے؟ ہم کو مسرت ہے کہ اس موقع پر بھی ہم کو مایوسی نہین ہوئی، یعنی صدیقی صاحب نے حسن کی اداؤن کو ایک کم حوصلہ اور ہوس پرست عاشق کی نگاہ سے نہین دیکھا ہے، بلکہ جن جذبات کا اظہار کیا ہے، ان سے ان کے عاشقانہ خلوص و ایثار، نیاز و عقیدت، بلند حوصلگی اور نکتہ سنجی کا کافی اندازہ ہوتا ہے، چند مثالین ملاحظہ ہون،

حسن کی ہر ادا زندگی کے نشو و نما کا سرمایہ ہے،

ہر ادائے حسن مین اک راز پنہان دیکھکر　　زندگی مین قوت بالیدگی آتی گئی

حسن کی رنگینیان در اصل جز و ایمان ہین، اس لئے سر نیاز جھکنے پر مجبور ہے،

حسن کی رنگینیون کو جز و ایمان دیکھکر　　بارگاہِ ناز مین سر کو جھکانا ہی پڑا

ذوقِ نظر کی اس قابلیت کی داد دینا آسان نہین ہے،

نگاہِ ناز کا تبسم عام طبائع کو برق بلا نظر آتا ہے، لیکن یہ وہ لمعۂ نور ہے، جس کے فیضان سے صدیقی صاحب کا تمام عرصہ گاہِ حیات دفعۃً جگمگا اٹھتا ہے،

مسکرائی نگاہِ سحر طراز　　زندگی جگمگائی جاتی ہے

اسی کیفیت کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے،

کہین ضیائے تبسم نہ ہو کر مفر ما   جمودِ قلب مین ہیجان زندگی کیون ہے

محبوب کے فیضِ نظر کی معجز طرازیون کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو، فرماتے ہین،

کبھی گلشن بداماں آئی تھی دل تک نظر اُنکی   مری نظرون مین ہو صد گلستان آج خزان آنکھ

اس اعجازِ نظر سے کس کو انکار ہو سکتا ہی لیکن صدیقی صاحب کے دل کی قابلیت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہی ابرِ کرم ہر جگہ برستا ہی لیکن ہر خاک لالہ و گل کی تجلی گاہ نہین بن سکتی،

بہارِ حسن محض عارضی نظر فروزی کا سامان نہین ہے، بلکہ وہ ذوقِ ابدی کا سرمایہ ہے، جس کو حاصل کرنے کے لئے صدیقی صاحب اپنی تمام دولتِ ہستی نثار کرنے پر آمادہ ہین،

تمام دولتِ ہستی لٹا کے مانگون گا   بہارِ حسن تری، ذوقِ جاودان اپنا

محبوب کی نگاہِ ستم مین بھی صدیقی صاحب کو ایک التفاتِ خاص کی جھلک نظر آتی ہے، اس لئے باوجود تباہی و بربادی کے ان کی زبان آلودۂ شکایت نہین ہوتی،

کچھ ایسی التفات نما تھی نگاہِ دوست   ہوتے رہے تباہ شکایت نہ کر سکے

محبوب کے خشم و عتاب مین جس دل کو تسکین و راحت محسوس نہین ہوتی، وہ صدیقی صاحب کے نزدیک اسرارِ محبت سے ناآشنا ہی،

دمِ عشق سے ناآشنا ہی دل شاید   ہنوز وجہ تجلی ترا عتاب نہین

عتاب کا وجہ تجلی ہونا بظاہر تعجب انگیز بات ہی، لیکن عشق کی طلبِ صادق نے ہمیشہ اسی برقِ عتاب ہی کے جلوون سے اکتسابِ فیض کیا ہے، زخمِ محبت کو ہمیشہ ناوکِ بیداد ہی کے ذوقِ خلش سے تسکین و راحت نصیب ہوتی ہی، چنانچہ اسی احساس کی بنا پر صدیقی صاحب نے یہ نعرۂ مستانہ بلند کیا ہی،

نہ آیا جگاہِ ناوکِ بیداد رہنے دے   جو اس کا نام بربادی ہی تو برباد رہنے دو

اہلِ ہوس تو ہمیشہ محبوب کے ظاہری لطف و کرم کے متمنی رہتے ہین، لیکن صدیقی صاحب اس حقیقت

سے باخبر ہین کہ محبوب کی حقیقی نوازش اس کے جور و ستم ہی مین پنہان ہی، لیکن ہر دل مین اس کے تحمل کی صلاحیت نہین ہوتی، اس لئے وہ یہ نہین چاہتے کہ یہ بجلی ہر جگہ گرتی رہے،

غم نہین سب پہ اگر چشمِ کرم ہو تیری   غم تو یہ ہو کہ ستم بھی ہو ترا عام ابھی

یہ اسی لطافتِ احساس کا نتیجہ ہے کہ صدیقی صاحب کبھی محبوب سے گلہ مندِ جفا نظر نہین آتے، بلکہ وہ اکثر خشم و عتاب ہی کے آرزومند رہتے ہین کہ ربط و تعلق کی حقیقی دلیل یہی ہی،

یہ التفاتِ مسلسل دلیلِ ربط نہین   تبسمون مین تمرارِ عتاب بھی دیکھین

نگاہِ ناز سے عام طبیعتون کو ستم طرازیون کی شکایت رہتی ہے، لیکن صدیقی صاحب کی آشفتہ مزاجی کو عدمِ عتاب کا شکوہ ہے کہ بغیر اس کے ان کے دل کو پر کیفِ اضطراب کی کیفیت محسوس نہین ہوتی،

نگاہِ ناز مگر مائلِ عتاب نہین   سکونِ قلب مین پر کیفِ اضطراب نہین

باوجود جفا شعار ہونے کے حسن پھر بھی صدیقی صاحب کے قلب و روح کا سرمایۂ قرار ہے،

لاکھ سہی جفا شعار پھر بھی قرارِ جان ہو تو   حسن سہی ستیزہ کیش حسن ہی غمگسار بھی

آستانۂ محبوب پر صدیقی صاحب سر جھکانے پر اس لئے مجبور ہین کہ وہ عالمِ کائنات کا سرمایۂ ناز ہے،

تو ہو وہ نازشِ فطرت کہ تمنا مین تری   آستانہ پہ بجز سر کو جھکائے نہ بنے

وصل کی خواہش محض تقاضائے ہوس ہی، طالبِ صادق کے لئے محبوب کا تصور ہی کافی ذوق آفرین اور لذت بخش ہی،

ایک فردوسِ تمنا ہے تصور تیرا   میرے بازو پہ تری زلفِ پریشان نہ سہی

یہ اسی تصور کا فیض ہی کہ صدیقی صاحب کی شبِ فرقت بجائے گریہ و زاری کے مستی و سرشاری کے عالم مین کٹ جاتی ہی،

یہ کس کا تصور ہے انیس شب ہجران اک عالم سرشاری پیہم ہے سحر تک

آداب محبت کا تقاضا ہے کہ بارگاہ حسن سے جو کچھ بھی عاشق کو مل جائے، اسی پر اس کو قانع و شاکر رہنا چاہئے، اپنی طرف سے کسی مزید خواہش کا اظہار نہ کرنا چاہئے، اس جذبۂ شکر و قناعت کو صدیقی صاحب نے ان سادہ لیکن موثر الفاظ مین ادا کیا ہے،

دل امیدوار کو نہ پوچھئے کہ کیا ملا بہت ہے جو بھی دیدیا نگاہ بے نیاز نے

صدیقی صاحب کو محبوب سے جو نیاز و عقیدت ہے، اس کا یہ عالم ہے کہ باوجود نامرادیون اور محرومیون کے وہ ترک جبین سائی پر آمادہ نہین ہین،

باوجود محرومی، باوجود ناکامی پھر وہی کسی کا در پھر وہی جبین سائی

جوش محبت کا یہ حال ہے کہ اُن کے خون دل کی اک اک بوند دل بن گئی ہے، تاکہ محبوب کی ہر نگاہ ناز پر اک تازہ دل نثار کیا جاسکے،

دل بنی جاتی ہے اک اک بوند دل کے خون کی ہر نگاہ ناز پر اک دل لٹانے کے لئے

لیکن ہم کو مسرت ہے کہ باوجود اس والہانہ نیاز و عقیدت کے صدیقی صاحب کے جذبۂ عشق مین ایک رسوائے سر بازار کی مبتذل ادائین نظر نہین آتین، اُن کے دل مین عشق کے وقار و عظمت کا بھی احساس ہے جس کا اندازہ ناظرین اشعار ذیل سے کرسکتے ہین،

یہ کیسے حجابات، یہ کیا دوری و قربت مشتاق نگاہون کے لئے حد نظر کیا

نگاہ ملتجی ٹھہر، کسی کو منفعل نہ کر ہے عشق کیا گداگری سوال بار بار کیون

چھپتے نہین بنتی ہے انہیں ارض و سما مین سمجھے تھے نظر دیکھتی ہے حد نظر تک

یہ پردۂ افلاک نہین مانع پرواز ہم یون کہ ابھی مائل پرواز نہین ہین

آپ کے اختیار مین گرچہ نظام عشق ہے عشق کی مستیان نہین آپکے اختیار مین

ممکن ہو کہ صدیقی صاحب کے خیالات مین ناظرین کو غیر معمولی فلسفیانہ تعمق یا دقت آفرینی نظر نہ آئے تاہم اُن کے قلم سے اکثر ایسے اشعار بھی نکل گئے ہین جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر حقائق سے بالکل بے خبر نہین ہے، چند اشعار ملاحظہ ہون،

آرزو سے سکون ہے بے معنی زندگی اضطراب پیہم ہے

پھر گیا ہجوم برق سر آشیان ہر آج کیون موج زندگی ہے سر بال و پر مرے

پرستار تو ہم ہے الٰہی یہ جہان اب تک ہے رسم بندگی رائج بقید آستان اب تک

معنی و مقصد ہستی کا سمجھنا معلوم عقل ہے صرف پرستاری اوہام ابھی

شوق نے پردے اٹھائے بارہا عقل صرف اختراع راز ہے

بہار نام نہین رنگ و بو کے طوفان کا وہ ایک کیفیت دل ہے جو خزان مین نہین

وہ بھی کچھ ایام نادانی کے گذرے ہین کہ جب موسم بے برگ تھے گل کو خزان سمجھا تھا مین

ہر چند زندگی ہے کسی اور شے کا نام جینے کے واسطے غم دنیا بھی چاہئے

مجھکو احساس رنگ و بو نہ ہوا یون بھی اکثر بہار آئی ہے

سعی پیہم کی جو لذت سے ہوئے ہین آگاہ اپنی منزل کو وہ خود دور بنا لیتے ہین

اس قسم کے اور بھی اشعار ہین، جو اس امر کا کافی ثبوت ہین کہ صدیقی صاحب کی شاعری مین نہ صرف دل کی حرارت بلکہ دماغ کی نکتہ سنجی کا عنصر بھی شامل ہے،

علاوہ حسن خیال کے شاعری کی ایک ضروری شرط انداز بیان کی ندرت و طرفگی بھی ہے، اس لحاظ سے بھی صدیقی صاحب مستحق ستایش ہین، کہ ان کا پیرایۂ بیان ہمیشہ شاعرانہ رہتا ہے، اور وہ زیادہ تر کنایون اور اشارون سے کام لیتے ہین جن سے طرز ادا مین ایک خاص دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، وہ زیادہ کھلتے نہین، لیکن اسی کے ساتھ اتنا چھپتے بھی نہین کہ شعر معمہ بن کر رہ جائے، اور اصل مفہوم

کی طرف سامع کا ذہن منتقل نہ ہونے پائے، صدیقی صاحب کو اگرچہ فارسیت سے خاص ذوق ہے، اور زیادہ تر وہ فارسی ترکیبوں سے کام لیتے ہیں، لیکن ان کو اس کا احساس ہے کہ غزل کی زبان صاف سادہ شیرین اور نرم و نازک ہونی چاہئے، اس لئے وہ حتی الوسع ثقیل اور نامانوس الفاظ و تراکیب کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں، جس کی وجہ سے بندش کی چستی، روانی اور برجستگی میں فرق آنے نہیں پایا، غرض مجموعی حیثیت سے صدیقی صاحب کا ایک خاص انداز بیان ہے، جس کا اندازہ ناظرین اشعار مذکورۂ بالا سے بخوبی کر سکتے ہیں،

ناظرین کو غالباً تنقید کے دوسرے رخ کا انتظار ہوگا، کسی شاعر کے کلام کا ہر قسم کی لغزشوں سے اور کمزوریوں سے قطعاً پاک ہونا یقیناً نہایت مشکل ہے، صدیقی صاحب کو غالباً اس کے اعتراف میں تامل نہ ہوگا، ممکن ہے کہ ان کے کلام میں نکتہ چین نگاہوں کو تلاش سے کچھ فرو گذاشتیں نظر آجائیں لیکن محض جزئی فرو گذاشتوں کی بناپر صدیقی صاحب کے شاعرانہ مذاق کی لطافت اور پختگی سے انکار کرنا سخت ناانصافی ہوگی، ان کے کلام کے متعلق ارباب فن کی جو رائے بھی ہو، لیکن بحیثیت ایک صحیح المذاق غزل گو شاعر کے ہم ان کا خیر مقدم کئے بغیر نہیں رہ سکتے، ہم کو تو صرف یہ دیکھ کر خوشی ہے، کہ وہ ایک نوحہ گر کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دل و دماغ میں ایک مطرب رنگین نوا کا کیف و سرور لے کر بارگاہ حسن میں حاضر ہوئے ہیں، ان کا یہ ادعا:-

گاتا ہوں محبت کے دل آویز ترانے   اک نوحہ گر عشق کی آواز نہیں ہیں

ہمارے نزدیک بالکل صحیح اور حق بجانب ہے،

کلیات فارسی

وفیات

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

دسمبر ۱۹۴۹ء کے وسط میں جدہ میں تھا، ۱۳ر دسمبر کی شام کو مغرب کے بعد حکومت سعودیہ کی وزارت خارجیہ جدہ میں ایک ہندوستانی مسافر کی دعوت تھی، شہر کے کچھ معززین اسلامی حکومتوں کے سفیر اس میں شریک تھے، ہندوستان، پاکستان، مصر و عراق وغیرہ کے سفیر اور وزارت خارجیہ سعودیہ کے بعض ارکان موجود تھے، میں ہندوستانی کونسل کے نمایندوں پروفیسر عبد المجید خان انڈین کونسل اور مولانا عبد المجید الحریری کمشنر حج متعین جدہ کے ساتھ وہاں پہنچا، احباب کچھ آچکے تھے، کچھ آرہے تھے، مختلف موضوعوں پر گفتگو تھی، خصوصیت سے کراچی میں اسلامی ملکوں کی جو اقتصادی کانفرنس ہو رہی تھی اس میں حجاز کی طرف سے حجاز کی اقتصادی حالت کی جو مطبوعہ رپورٹ اس وقت سامنے رکھی تھی اس پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں جدہ میں پاکستانی کونسل مسعود صاحب جو مولانا ابو البرکات عبد الرؤف صاحب دانا پوری کے صاحبزادہ ہیں، تشریف لائے، اور نہایت افسوس کیساتھ یہ ذکر کیا کہ آج مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا انتقال ہو گیا، اس خبر کے سننے کے ساتھ مجلس پر اداسی چھا گئی، میرے سامنے سے پوری نصف صدی کی معاصرانہ صحبتوں کی ایک دنیا گذر گئی،

۱۹۰۲ء کی بات ہے، وہ دار العلوم دیوبند میں اور راقم دار العلوم ندوہ میں تعلیم پا رہے تھے، یہ زمانہ دونوں درسگاہوں کا زرین زمانہ تھا، دار العلوم ندوہ میں میرے ساتھ میرے ایک عزیز قریب و ہموطن (مولوی سید محمد قاسم صاحب خلف الرشید مولانا شاہ تجمل حسین صاحب خلیفہ شاہ فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی، و حضرت مولانا شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، رحمہم اللہ تعالیٰ) رفیق درس تھے، وہ اپنے والد کے حکم سے

ندوہ چھوڑ کر دیوبند چلے گئے تھے، اُن کو طالب علموں کی انجمن سازی اور دفتر داری کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، چنانچہ دیوبند پہنچ کر انھوں نے اس سلیقہ کا ثبوت دیا، اور دیوبند میں طالب علموں کی تقریر و تحریر کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، مولانا شبیر احمد صاحب جو ان دنوں اُنسی کی عمر کے طالب علم تھے، اور تقریر و تحریر کا فطری ذوق رکھتے تھے، ان جلسوں میں دلچسپی لیتے تھے، اور اسی مناسبت سے مولوی قاسم سے بھی ان کو محبت تھی، مولوی قاسم نے ندوہ و دیوبند کو ملانا چاہا۔ وہ میرے خطوں میں مجھ سے مولانا شبیر احمد صاحب کا تذکرہ کرتے تھے اُن کو سلام پہنچاتے تھے، اور میرا تذکرہ ان سے کرتے تھے، اور میری طرف سے ان کو سلام پہنچاتے تھے، اس تعلق کا یہ اثر ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے آشنا اور ایک دوسرے کو واقف ہوگئے، یہ وہ زمانہ تھا جب دیوبند سے القاسم اور ندوہ سے الندوہ نکل رہا تھا، اور ہم دونوں کے مضامین اپنے اپنے پرچہ میں نکلتے تھے، اور چھپتے تھے، اسی زمانہ میں مرحوم کسی تعلق سے لکھنؤ آئے، تو مدرسہ میں مجھ سے ملنے آئے، یہ میری اُن کی طالب علمانہ ملاقات کا پہلا موقع تھا، یہ غالباً ۱۹۰۲ء کی بات ہو،

۱۹۰۶ء میں میری دستار بندی ہوئی، اور دستار بندی کے جلسہ میں برجستہ عربی تقریر کی وجہ سے عربی مدرسوں میں ایک خاص شہرت حاصل ہوئی، اور اسی زمانہ میں مولانا کو بھی فراغت حاصل ہوئی، وہ دار العلوم دیوبند میں اور میں دار العلوم ندوہ میں مدرس ہوگئے، اسی کے سال دو سال کے بعد کسی انجمن کی دعوت پر پنجاب جانے کا اتفاق ہوا، تو راہ میں سہارنپور اتر کر دیوبند چلا گیا، یہ میری حاضری کا پہلا اتفاق تھا، ان دنوں دار العلوم دیوبند میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب (خلف مولانا سید حکیم عبد الحی صاحب ناظم ندوہ) ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر دیوبند میں حدیث کے دورہ میں شریک تھے، میں نے اس کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی پہچانے نہیں، منھ چادر میں لپیٹے تھا، مدرسہ پہنچ کر سید عبد العلی صاحب کو پوچھا، ان کے کمرہ میں گیا، وہ مجھے یک بیک دیکھ کر زبان سے کچھ کہا ہی چاہتے تھے کہ میں نے اشارہ سے ان کو منع کیا، اور وہ رک گئے، اور ساتھ ہو کر مدرسہ اور درس کے کمرے دکھانے لگے، اور آخر میں اوپر چھت پر دار الشوریٰ

اور دار الاہتمام دکھانے لے گئے، اتفاق دیکھئے کہ ایک طالب علم جو پہلے ندوہ میں پڑھتے تھے، اور اب دیوبند میں زیر تعلیم تھے، وہ دار الاہتمام سے نکل رہے تھے، وہ مجھے دیکھنے کے ساتھ دوڑ کر مولانا حبیب الرحمان صاحب نائب مہتمم کی خدمت میں چلے گئے، اور میرا نام بتا دیا، موصوف نے جو ہمہ تن متواضع اور خاکسار تھے، ایک معمولی طالب علم کے لئے یہ زحمت فرمائی کہ تشریف لائے اور اپنے ساتھ اندر کمرہ کے لے گئے، اور چائے کی دعوت فرمائی جس میں اکثر حضرات مدرسین شریک تھے، دوسرے وقت حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ نے اپنے فضیلت کدہ پر کھانے کی دعوت فرمائی،

ایک طالب علم کے لئے سب سے بڑی دعوت طالب علموں کے جلسہ کی ہو سکتی تھی، چنانچہ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے جلسہ کا اہتمام فرمایا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس تھے، مگر اس خدمت سے علٰحدگی کا خیال کر رہے تھے، اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب تازہ تازہ حجاز سے ہندوستان وارد ہوئے تھے، جلسہ آراستہ ہوا، طالب علموں نے تقریریں کیں، آخر میں مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب نے عربی میں تقریریں کیں، اور پھر اس کم سواد کو عربی میں تقریر کا حکم ہوا، اور اس نے تعمیل کی،

اس زمانہ میں آریوں کی تحریک سے شدھی کا زور تھا، اور عربی مدرسوں میں آریوں سے مناظرہ کی تعلیم دی جاتی تھی، چنانچہ جلسہ کے بعد طالب علموں نے آریہ اور مسلمانوں کے مناظرہ کا مظاہرہ کیا، طالب علموں کے دو گروہ بنے، ایک ایک مسئلہ کا حامی تھا، دوسرا اس پر معترض، باہم سوال و جواب اور رد و قدح کا سلسلہ قائم تھا کہ ایک فریق کمزور سا پڑ گیا، مولانا شبیر احمد صاحب جو مدرسین کے ساتھ میرے قریب بیٹھے تھے، مولانا حبیب الرحمن صاحب سے اجازت لے کر مدرسین کی صف سے نکل کر طالب علموں میں مل گئے، اور اس کمزور فریق کی حمایت میں فرمانے لگے، اور آخر اپنی تقریر کی قوت اور استدلال کے زور سے ہارا ہوا میدان جیت لیا، اور سب نے ان کی ذہانت اور طباعی کی داد دی، میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی تمام

عمر میں ایک دفعہ زیارت کی، اور وہ اسی موقع پر نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ ایک کمرہ میں جس میں کھری چارپائی اور ایک چٹائی اور ایک مٹی کا لوٹا تھا، تشریف فرما تھے،

اس واقعہ پر سالہا سال گذر گئے، مولانا شبیر احمد صاحب دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور سال بہ سال ادنی سے اعلیٰ کتابوں کا درس دیتے ہوئے کتب حدیث کا درس دینے لگے، کچھ دنوں کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی میں صدر مدرس ہو گئے، اسی زمانہ میں میرا بھی دلی جانا ہوا، تو مدرسہ میں ان سے ملاقات ہوئی، مگر پھر دارالعلوم دیوبند لوٹ آئے، اسی زمانہ میں مولانا عبید اللہ سندھی حضرت مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی طلب پر دیوبند آکر مقیم ہوئے تھے، ان کا مشن یہ تھا کہ دیوبند پر جو تعلیمی فضا محیط ہو گئی تھی، اور سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید کی مجاہدانہ روح جو اس حلقہ سے دبتی چلی جا رہی تھی، اس کو دوبارہ زندہ کیا جائے، اور اس سلسلہ میں موتمر الانصار کی بنیاد پڑی، اور اس کا ۱۹۱۱ء یا اس کے پس و پیش زمانہ میں مرادآباد میں بہت بڑا جلسہ ہوا، جس میں علی گڈہ اور ندوہ اور دیوبند کے اکثر رجال علم و عمل جمع ہوئے، اور تمام ہندوستان سے مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع اس میں شریک تھا، ندوہ سے حضرت الاستاذ مولانا شبلی مرحوم شریک ہوئے تھے، اس جلسہ میں مولانا شبیر احمد صاحب نے العقل و النقل کے نام سے اپنا ایک کلامی مضمون پڑھکر سنایا، حاضرین نے بڑی داد دی، اس مضمون میں گو جدید معلومات حضرۃ الاستاذ کی تصنیف سے لئے گئے تھے، مگر اس کا نتیجہ اس کے برعکس نکالا گیا تھا، یہ گویا حامیان عقل کے اس علم کلام کا رد تھا، جس میں خرق عادت کے وجود اور معجزات کے صدور پر ناک بھوں چڑھائی جاتی تھی، حضرت الاستاذ نے واپس آکر مجھ سے فرمایا تھا، کہ انھوں نے معلومات میری کتاب سے لئے اور پھر میرا ہی رد کیا،

دیوبند کے حلقہ میں اس زمانہ میں یہ بات برملا کہی جاتی تھی کہ مولوی شبیر احمد صاحب کو حضرت مولینا قاسم صاحب کے علوم و معارف پر پورا احتوا ہے، وہ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مضامین و معانی کو لیکر اپنی زبان اور اپنی طرز ادا میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ وہ دلنشین ہو جاتے تھے، یہ خیال رہے کہ مولانا قاسم صاحب

رحمہ اللہ تعالیٰ کے مضامین نہایت غامض، دقیق اور مشکل ہوتے تھے جن تک عوام کی پہنچ نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے اُن کے مضامین اور حقائق کو سمجھنا، پھر زمانہ کی زبان میں اس کی تعبیر و تفہیم کوئی آسان بات نہ تھی، اور اسی لئے مولانا شبیر احمد کی تقریر و تحریر کی تعریف کی جاتی تھی،

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک مسلمانوں کی سیاست کروٹ لے رہی تھی، یکے بعد دیگرے طرابلس، پھر کانپور کی مسجد، پھر بلقان کی جنگ، پھر یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے واقعات پیش آئے، اور ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کی سیاسی تحریک بڑھتی اور پھیلتی گئی،

یہاں پر ایک بات مجھے بے محابا کہنا ہے یہ وہ وقت تھا کہ جب مولانا ابو الکلام کا الہلال نکل رہا تھا، اُن کی آتش بیانی سے مسلمانوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی، اور وہ جہاد جس کے نام لینے سے لوگ ڈرنے لگے تھے، مولانا ابو الکلام نے اس کا دعوا اس بلند آہنگی اور بیباکی سے پھونکا کہ یہ بھولا ہوا سبق لوگوں کی زبانوں پر آگیا، الہلال دیوبند کے حلقہ میں بھی آتا تھا، اور حضرت مولانا محمود حسن کی مجلس میں پڑھا جاتا تھا، میں نے اوس زمانہ میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا یہ فقرہ سنا تھا کہ ہم نے جہاد کا سبق بھلا دیا تھا، اور ابو الکلام نے ہم کو پھر یاد دلا دیا،

اس زمانہ میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمان تھے، مگر یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی، اس حلقہ کی ایک جماعت پر مدرسہ کے مصالح مقدم تھے، اور دوسرے پر اسلام کے مصالح، مولانا محمود حسن صاحب دل سے دوسری جماعت میں شریک تھے، میں نے سنا کہ انھوں نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے تو مدرسہ اپنے اصلی مقصد (جہاد) پر پردہ ڈالنے کے لئے بنایا تھا، بہرحال مولانا عبید اللہ سندھی کو دیوبند سے ہٹنا پڑا، اور دہلی میں مسجد فتحپوری کے ایک گوشہ میں دائرۃ المعارف کی بنیاد ڈالی، اور اس میں انگریزی خواں تعلیم یافتوں اور عربی کے فارغ التحصیل عالموں کو قرآن پاک کا درس اس جہادی اسپرٹ میں دینے لگے، جو سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی زندگی کی روح تھی، اور مجاہدین

سرحد (یاغستان وچمرقند) سے حلقۂ اتصال قائم کیا گیا، اس وقت یورپ کی جنگ کے شعلے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، اور ہندوستان میں بغاوت کا خیال روز افزون تھا، انگریزی حکومت کی جاسوسی اپنا کام کر رہی تھی، مولانا ابوالکلام محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی وغیرہ احرار سب نظر بند تھے، یا جیل میں تھے، حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان سے ہجرت کی، اور وہ حجاز میں قید ہو کر مالٹا میں نظر بند ہوئے، اور مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا عبید اللہ انصاری چھپ کر افغانستان پہنچ گئے، جو لوگ اب باقی رہ گئے تھے، ان میں بڑے لوگ حکیم اجمل خان مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی تھے، ان لوگوں نے قوم کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اور پہلے مجلس خلافت اور پھر جمعیۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، اس وقت تک مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹے میں تھے، ۱۹۲۰ء میں جو وفد خلافت لندن گیا تھا، اس کا ایک ممبر یہ راقم الحروف بھی تھا، غالباً مارچ یا اپریل میں جب مسٹر فشر وزیر تعلیم قائم مقام وزیر ہند سے ملاقات ہوئی، تو میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی اسیری و نظر بندی کے معاملہ کو ان کے سامنے پیش کیا، یاد آتا ہے کہ موصوف اسی سال کے اخیر یا ۱۹۲۱ء کے شروع میں مالٹے سے چھوٹے مگر مع خدام کے جن میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی تھے، واپس آئے مگر شاید چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہے، اور وفات پائی، اس درمیان میں عقیدتمندوں نے ہر سمت سے ان کو بلایا، مگر خود تشریف نہ لیجا سکے، اپنے قائم مقام یا ترجمان کی حیثیت سے مولانا شبیر احمد صاحب ہی کو بھیجا، ان مقامات میں سے خاص طور سے دہلی کے جلسہ میں ان کی نیابت نہایت یادگار اور مشہور ہے، گائے کی قربانی ترک کرنے کے مسئلہ میں بھی جس کو حکیم اجمل خان مرحوم نے اٹھایا تھا، حضرت مولانا شیخ الہند کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے نہایت دلنشین تقریر فرمائی تھی، یہ ترجمانی اور نیابت مولانا شبیر احمد صاحب کے لئے عزت و فخر و شرف کا باعث بلکہ ان کی سعادت اور ارجمندی کی بڑی دلیل ہے،

۱۹۲۲ء کے آخر میں گیا میں کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے شاندار اجلاس ہوئے، جمعیۃ کے اس اجلاس

کے صدر مولانا حبیب الرحمان صاحب تھے، ان کے ساتھ حلقۂ دیوبند کے اکثر اساتذہ آئے ہوئے تھے، اون میں مولانا شبیر احمد صاحب بھی تھے، کانگریس اور جمعیۃ کے یہ اجلاس ایک خاص حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں یعنی اس اجلاس میں کانگریس کی سیاست میں ایک اہم تبدیلی ہوئی، اور پنڈت موتی لال، سی آر داس، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کی رہنمائی میں ترک موالات کی جگہ جس میں کونسلوں اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ بھی تھا، یہ تجویز سامنے رکھی گئی، کہ ان کونسلوں اور اسمبلیوں پر قبضہ کرکے حکومت کو بے دست و پا کر دیا جائے، گویا مقصد یہ تھا کہ مقصود کے حصول کے لئے طریق جنگ اور لڑائی کے ڈھنگ کو بدلا جائے، اس تحریک کے حامیوں نے سوراج پارٹی اپنا نام رکھا، اس وقت گاندھی جی، ابوالکلام محمد علی وغیرہ جیل میں تھے، ان کے خالص پیرووں نے اس کی سخت مخالفت کی، اور نو چینجر (نہ بدلنے والے) کا لقب پایا، کانگریس کی طرح جمعیۃ میں بھی حکیم صاحب نے اس تجویز کو پیش کیا، اور اس کے فیصلہ کے لئے ارکان جمعیۃ کا خاص جلسہ ہوا، تجویز کے حامیوں کی طرف سے خاکسار نے اور مخالفوں کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریریں کیں، مولانا شبیر احمد صاحب کی اس تقریر کا صرف ایک حصہ مجھے یاد ہے، جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام خانہ کعبہ کی فتح کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے تھے، مگر چونکہ قریش نومسلم تھے، ان کو یہ بات کعبہ کی حرمت اور ادب کے خلاف نظر آئی، اس لئے حضور نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہاری قوم تازہ مسلمان نہ ہوتی، تو میں کعبہ کو ڈھا کر پھر اس کی بنیاد ابراہیمی اساس پر رکھتا، یہ واقعہ بیان کرکے مولانا نے فرمایا کہ ترک موالات کے بدولت ابھی ہماری قوم انگریزوں کی غلامی سے نئی نئی نکلی ہے، یہ کونسل اور اسمبلی کے چکر میں پڑ کر پھر نہ غلام بن جائے، بہرحال ووٹ لئے گئے، اور مولانا کی مخالفت کامیاب ہوئی،

مولانا حسین احمد صاحب کا نام اس وقت تک خواص سے نکل کر عوام تک نہیں پہنچا تھا، وہ اس تمام ہنگامہ کے وقت حضرت شیخ الہند کے ساتھ مالٹے میں تھے، ساتھ ہی ۱۹۲۱ء میں ہندوستان واپس آئے،

اور سب سے پہلی دفعہ وہ ہندوستان کی سیاست مین کراچی خلافت کانفرنس مین مقرر کی حیثیت سے نمودار ہوئے،
اور اس مشہور انقلابی تجویز کے مؤیدین مین تھے جس مین مسلمان فوجیون سے فوج کی ملازمت ترک کرنے
کی تحریک تھی، اس کے محرک محمد علی، اور مؤید مولانا حسین احمد، پیر غلام مجدد اور سیف الدین کچلو وغیرہ تھے،
آخر سب پر مقدمے چلائے گئے، اور سب کو چند سال کی قید کی سزا ہوئی، ع

بڑھاپے اور ذوق گنہ یان سزا کے بعد

اس قید سے آزادی کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب بیش از بیش تحریکات مین حصہ لینے لگے، اُمہ
آخر خلق کی زبان نے ان کو شیخ الہند کا جانشین مان لیا، اور اب حضرت شیخ الہند کے مسلک کی ترجمانی
اور اُن کی جماعت کی نمایندگی مولانا موصوف فرمانے لگے، تاہم خلافت اور جمعیۃ کے جلسون مین مولانا شبیر احمد
صاحب بھی آ جاتے رہتے تھے، لیکن یہ آمد و رفت بھی کم ہوتی رہی،

۱۹۲۶ء مین جب سلطان ابن سعود نے مکہ معظمہ مین عالمگیر اسلامی کانفرنس بلائی، اور ہندوستان
کی مختلف مجلسون کی طرف سے وفد بھیجے گئے، تو خلافت کے وفد کی صدارت حکیم صاحب اور احرار پنجاب کے
اصرار سے اس خاکسار کے حصہ مین آئی، اور اس کے ممبر محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی ہوئے، اور جمعیۃ العلماء
کے وفد کے صدر مولانا کفایت اللہ صاحب، اور ممبر حافظ احمد سعید صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولینا
عبد الحلیم صدیقی صاحب اور مولانا عرفان صاحب مرحوم تھے، یہ کل وفد ایک ہی جہاز پر حجاز کو روانہ ہوا، اور
اس طرح اس سفر مین مرحوم کو بہت پاس سے دیکھنے کا موقع ملا، طبیعت مین بڑی نزاکت تھی، اور بات بات
مین وہ چیز ظاہر ہوتی تھی، اس لئے رفقائے سفر ان کی بڑی رعایت کرتے تھے، ایک مینی طالب علم جو دیوبند مین
ان کے شاگرد تھے، ان کی خدمت کرتے تھے، اور یہ خدمت پورے سفر حجاز مین انھون نے کی، جدہ سے مکہ معظمہ
تک ہم سب ایک لاری مین آئے، جب مکہ معظمہ قریب آیا تو مرحوم پر عجب کیفیت تھی، انھون نے قرآن کا احرام
باندھا تھا اور ہم سب تمتع کے احرام مین تھے، جیسے جیسے مکہ معظمہ قریب آتا جاتا تھا، ان پر گریہ کا غلبہ ہوتا جاتا تھا،

اور پھوٹ کر رو رہے تھے، یہ ان کا دوسرا حج تھا، مکہ مین موتمر کے جلسے ایک ماہ کے قریب ہوتے رہے،
ان مین ہم لوگ شریک ہوتے رہے، اور اکثر مولانا شبیر احمد صاحب بھی شریک ہوتے تھے، اسی سفر مین مجھے علم
ہوا کہ موصوف عربی تحریر و تقریر پر اچھی طرح قادر تھے، سلطان نے خلافت اور جمعیۃ کے دونون وفدون کو
ایک ساتھ ملنے کو بلایا، اور مختلف موضوعون پر گفتگو کی، مولانا شبیر احمد صاحب نے اس موقع پر خلاف توقع اپنے
اکابر دیوبند کے عقائد اور فقہی مسلک پر اچھی اور شستہ گفتگو کی، اور سلطان اس کو دیر تک سنتے رہے،

موتمر کی کارروائیون مین تو مولانا نے کوئی خاص حصہ نہین لیا، مگر موتمر کے آخری اجلاس مین ایک
مضمون انھون نے پڑھ کر سنایا، جس کو پہلے سے وہ لکھ لائے تھے، مگر اپنے رفقا کو وہ پہلے سے نہین دکھایا تھا،
مین اس اخیر جلسہ مین شریک نہ تھا، مگر وفد جمعیۃ کے ارکان کو مولانا کے اس تنہا بیان سے بڑی حیرانی تھی،
بہرحال بات چپ چپ ختم ہوگئی،

حج کے مناسک مین بھی ان کی رفاقت رہی، یہ زمانہ گرمی کا تھا، باد سموم کے جھونکے چل رہے تھے،
ظہر کے وقت ذوق و شوق مین مسجد نمرہ مین نماز پڑھنے کی آرزو تھی، مگر آفتاب کی حدت اور دھوپ کی تمازت
دیکھ کر ہمت نہین پڑتی تھی، مگر مولانا کفایت اللہ صاحب اور حافظ احمد سعید نے اونٹون کا سامان کر لیا تھا،
آخر مولانا کفایت اللہ صاحب کے ساتھ اونٹ پر ان کا ردیف بن کر چلا، مجھے ہر قدم پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ
اب گرا، اور تب گرا، اسی خرخشہ سے واپسی مین پیدل آیا، اسی موسم کی شدت مین مولانا شبیر احمد صاحب پیدل
ہی روانہ ہوئے، مسجد کے قریب ہی پہنچے تھے کہ باد سموم کے ایک جھونکے نے ان کو آ لیا، مگر بال بال بچ گئے،
اس نماز مین آنے کا شوق اس خیال سے بھی تھا کہ سلطان امامت کرین گے، اور ایک سلطان وقت کے
پیچھے ہم ہندوستان کے غلام نماز پڑھین گے، مگر مسجد مین جماعت تیار تھی، سلطان کا انتظار رہا۔ وہ نہین
آئے، تو ایک مصری شیخ نے نماز پڑھائی، نماز ختم ہوئی تو دیکھا کہ سلطان اپنے نجدی ہمراہیون کے ساتھ ننگے
سر اور ننگے پاؤن لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے آ رہے ہین، بعد کو جب سلطان سے ملاقات ہوئی تو مین نے حاجیون

کی طرف سے شکایت پیش کی، کہ نماز میں آپ کا بڑا انتظار رہا۔ سلطان نے کہا ہمارے نجدی بھائی آپ جانتے ہیں کہ جھڑی نہیں لگاتے، اس لئے میں نے چاہا کہ ذرا آفتاب ڈھل جائے، تو چلوں، مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی نماز ہو گئی، پھر کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں بچپن ہی سے بے گھر ہو گیا تعلیم جیسی چاہیے نہیں ہوئی، بدو ہوں، قرأت نہیں جانتا، بدآواز بھی ہوں، اس لئے نماز پڑھانے سے گریز کرتا ہوں، میں نے مذاقاً کہا کہ سال میں ایک دفعہ لوگ آسانی سے اس آواز کو گوارا کر سکتے ہیں، مولانا شبیر احمد صاحب نے فرمایا کہ ہم ہندوستان کے مسلمان تو مشتاق رہتے ہیں کہ کسی بادشاہ یا امیر کے پیچھے نماز پڑھیں، امیر افغانستان جب ہندوستان آئے تھے، تو مسلمان سیکڑوں کوس سے اُن کے پیچھے نماز پڑھنے آئے تھے،

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک سفر میں بھی رفاقت رہی، میں گو محمد علی و شوکت صاحب وغیرہ کے ساتھ تھا، مگر ہم جنسی اور ہم مذاقی کے سبب سے اکثر جمعیۃ والوں کے یہاں آکر بیٹھا کرتا تھا، اونٹوں کا سفر تھا، بارہ روز میں منزلیں تمام ہوئیں، ہر روز ایک نئی منزل میں قیام تھا،

ہر روز مرا نیا مقام　　صبح کہیں، کہیں ہے شام
عشق کی منزلیں تمام　　راہ دور و دراز ہیں

میں مرحوم کی خدمت میں بیٹھتا، اور طرح طرح کی باتیں ہوتیں، ایک منزل میں مرحوم نے غدر دہلی کے زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے رفقائے جہاد، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، اور حافظ ضامن علی صاحب شہید کے واقعات اور تھانہ بھون اور شاملی پر تاخت اور مجاہدین کا حملہ اور حافظ صاحب کی شہادت کے واقعات کو اس پر اثر طریقہ سے بیان فرمایا کہ روح نے لذت پائی،

واپسی میں مولانا جہاز پر بہت علیل ہو گئے تھے، حالت بہت نازک معلوم ہوتی تھی، دوسرے درجہ میں ان کا سفر تھا، جو جہاز کے پچھلے حصہ میں تھا، وہاں بڑی تکلیف جہاز کے بعض آلات کا دھڑ دھڑ کرکے نیچے

گرنا تھا، اسی حالت میں ہندوستان پہنچے، بالآخر اُن کو صحت ہو گئی،

اُن کی آنکھیں کمزور تھیں، ایک دفعہ تو تکلیف بہت بڑھ گئی تھی، موگا (پنجاب) کے ڈاکٹر آنکھوں کے مشہور ڈاکٹر تھے، ان سے علاج کرایا تو درست ہو گئی تھیں،

مرحوم اب تک دار العلوم دیوبند میں مدرس تھے، دار العلوم دیوبند کے اکابر میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد سے کچھ انتشار سا تھا، جو رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا، ایک طرف مولانا حبیب الرحمن صاحب اور مولانا حافظ احمد صاحب اور کچھ مدرسین تھے، دوسری طرف مولانا انور شاہ صاحب مفتی عزیز الرحمن مولانا سراج احمد صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، اور بعض نوجوان مولوی عتیق الرحمن صاحب وغیرہ تھے، آخر دوسرا گروہ دیوبند کو چھوڑ کر گجرات میں ڈابھیل ضلع سورت میں منتقل ہو گیا، جہاں پہلے سے ایک معمولی سا مدرسہ قائم تھا، مگر عمارت اچھی خاصی تھی، مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد اور مولانا سراج احمد صاحب وغیرہ نے یہاں دوسرا دیوبند قائم کیا، بہت سے سرحدی اور ولایتی اور بنگالی، اور ہندوستانی طالب علم بھی اُن کے ساتھ آئے، اور چند سال تک زور و شور سے ان صاحبوں کا درس وہاں جاری رہا،

اسی زمانہ میں خاکسار کو کسی جلسہ کے سلسلہ میں راندیر ضلع سورت جانے کا اتفاق ہوا، ڈابھیل قریب ہے، مولانا شبیر احمد صاحب کو معلوم ہوا تو ایک حیدرآبادی طالب علم کو خط دیکر بھیجا، میں نے آنے کا وعدہ کیا، اور دوسرے روز ڈابھیل گیا، مدرسہ کو دیکھا، حضرات مدرسین سے ملاقات ہوئی، طلبہ سے ملا، طلبہ نے میرے لئے ایک جلسہ ترتیب دیا، جس میں تقریریں ہوئیں، رات کو قصبہ میں جلسہ کا انتظام ہوا، جس میں مختصر تقریر کی، اس کے بعد خود مولانا نے تقریر فرمائی، جس میں میری حقیر ذات کی نسبت ایک فقرہ استعمال کیا تھا، جو درحقیقت میری حقیقت ہے، میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ مجھے اُن سے بہت اُنس ہے، اس لئے کہ یہ علماء اور تعلیم یافتوں کے درمیان ایک سفیر و متوسط کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر میری کتاب ارض القرآن کی تعریف فرمائی،

ان کے گجرات کے قیام کے زمانہ مین اُن کی آمد و رفت حیدرآباد دکن کی طرف بہت بڑھ گئی تھی، شرح صحیح مسلم کی امدادی تحریک جاری تھی، اور کبھی کبھی میرا بھی جانا ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک میلاد کی مجلس مین میرا ان کا ساتھ ہوگیا، اسی جلسہ مین خود حضور نظام بھی آنے والے تھے، میری تقریر ہو رہی تھی کہ وہ آگئے، میرے بعد مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر شروع کی، حضور نظام نے بڑی داد دی، اور اہلِ محفل محظوظ ہوئے، لوگون مین باہمی ترجیح کی اچھی خاصی رد و کد شروع ہوگئی، مگر بحمد اللہ دونون مقررون کے دل باہم صاف رہے اور زبانین محفوظ،

مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب و مقرر تھے، عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بھی بیان کرتے تھے، جس سے اہلِ محفل کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی، اور ظریفانہ فقرے اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود نہین ہنستے تھے، مگر دوسرون کو ہنسا دیتے تھے، ان کی تقریرون مین کافی دلائل بھی ہوتے تھے، اور سیاسی اور علمی اور تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی، ذہانت و طباعی، اور بدیہہ گوئی ان کی تقریرون سے نمایان ہوتی تھی، اکبر کے ظریفانہ اور فلسفیانہ شعر ان کو بہت یاد تھے، وہ انکو اپنی تقریرون مین عمدگی سے کھپاتے تھے،

ان کی تحریر بھی صاف شستہ تھی، اور اس عصر کے اچھے لکھنے والون کے لٹریچر کو غور سے پڑھا تھا، اور اس سے فائدہ اٹھایا تھا، جمعیۃ و خلافت کے جلسون مین علمار کی بعض تجویزون کی انگریزی بنانے مین بڑی دقت ہوتی تھی، اس موقع پر محمد علی مرحوم نے کہا تھا کہ مولوی شبیر احمد صاحب کی عبارت کی انگریزی بنانے مین بڑی آسانی ہوتی ہے، کیونکہ اس کی ساخت انگریزی طرز پر ہوتی ہے،

موصوف کے مضامین اور چھوٹے رسائل تو متعدد ہین، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اردو مین ان کے قرآنی حواشی ہین، جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمۂ قرآن کے ساتھ چھپے ہین، ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی، اور تفسیرون پر عبور اور عوام کے ذہن نشین کرنے کے لئے انکی

قوت تفہیم حد بیان سے بالا ہے، مجھے امید ہے کہ ان کے ان حواشی سے مسلمانون کو بڑا فائدہ پہنچا ہے، ان حاشیون مین انھون نے جابجا اپنے ایک معاصر کی تصنیف کا حوالہ صاحب ارض القرآن کے نام سے دیکر اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ وہ معاصرانہ رقابت سے کس قدر بلند تھے، مین نے اپنے حلقۂ درس مین ان کے حواشی کی افادیت کی ہمیشہ تعریف کی ہے، اور ان کے پڑھنے کی ترغیب دی ہے، افسوس یہ ہے کہ یہ حاشیے بہت باریک چھاپے گئے ہین، اس لئے اُن سے استفادہ مین مشکل پڑتی ہے، ان حواشی کی افادیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حکومت افغانستان نے اپنے سرکاری مطبع سے قرآنی متن کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور مولانا شبیر احمد صاحب کے حواشی کو افغانی مسلمانون کے فائدہ کے لئے فارسی مین ترجمہ کرکے چھاپا ہے،

صحیح مسلم کی شرح لکھنے کا خیال ان کو اپنی نوجوانی کے عہد سے تھا، صحیح بخاری کی شرح تو احناف مین سے حافظ بدر الدین عینی نے بہت پہلے لکھ کر احناف کی طرف سے حق ادا کر دیا تھا، مگر صحیح مسلم کی کوئی شرح حنفی نقطۂ نظر سے اب تک نہین لکھی گئی تھی، اس کے لئے مرحوم نے اپنے دست و بازو کو آزمایا،

انگریزون کے عہد مین دیوبند مین جو بعض سیاسی اختلافات پیدا ہوگئے تھے، اور کانگریسی اور لیگی خیالات مین جو آویزش تھی، اس کی اطلاع حیدری صاحب صدر اعظم حیدرآباد کے کانون تک پہنچی تھی، اس سلسلہ مین انھون نے مناسب سمجھا کہ مولانا شبیر احمد کو مہتمم بناکر دیوبند بھیجین، چنانچہ وہ اس صورت سے ڈابھیل سے واپس آکر دیوبند مین مقیم ہوئے، اور اہتمام کا کام شروع کیا، مگر ظاہر ہے کہ صرف تقرر اور منصب سے خیالات اور نظریون کا اختلاف دور نہین ہو سکتا تھا، چنانچہ طلبہ مین اسٹرائیک ہوئی اور بعض نامناسب واقعات پیش آئے جن کا نتیجہ ان کا استعفا تھا،

اس موقع پر مجھے ایک بات یاد آئی، ۱۹۱۳ء کی بات ہے کہ ندوہ مین مولانا شبلی کے استعفے پر ایک عظیم الشان اسٹرائیک ہوئی تھی، جس مین علی گڑھ اور دیوبند وغیرہ ندوہ کے اہلِ اہتمام کے ساتھ تھے، اور ملک اور قوم کے آزاد اخبارات مولانا ابو الکلام کی رہنمائی مین طلبہ کی تائید مین تھے، اس وقت مولانا عبد السلام صاحب

ندوی کا ایک مضمون "الاعتصاب فی الاسلام" کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا، اس کے جواب میں مولانا شبیر احمد صاحب کا مضمون اسی الہلال میں نکلا تھا، جس میں اسٹرائک کو خلاف اصول بتایا تھا، اس مضمون میں ایک مصرع یہ بھی تھا ع

لو آپ اپنے جال میں صیاد آگیا

پھر جب دیوبند کے احاطہ تک اسٹرائکوں کا سیلاب پہنچا تو ان کا یہ مضمون مجھے بہت یاد آیا،

موصوف کے حیدرآباد دکن اور نظام حیدرآباد سے گوناگون تعلقات پیدا ہوگئے تھے، مرحوم نے اس ہنگامہ میں جو آریہ تحریک کے زمانہ میں حیدرآباد کے مسلمانوں میں پیدا ہوگیا تھا، اپنی تقریر سے بہت کچھ مسلمانوں میں سکون پیدا کیا، یہاں تک کہ حیدری صاحب اپنی ممنونیت ان کی ذات کی نسبت ظاہر کی، اور منصب میں ترقی کی، مگر ایک وقت ایسا آیا کہ جب نظام پر تفضیلیت کا غلبہ تھا، اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے، تو مرحوم نے تقریر فرمائی، جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دلنشین طریقہ سے بیان کئے تھے، اس دن لوگوں کو مرحوم کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی، اور ان کے بے باکانہ اظہار حق کی سب نے تعریف کی،

مجھے خیال آتا ہے کہ مرحوم ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں انجمن اسلامیہ اعظم گڈھ کی دعوت پر اعظم گڈھ آئے اور شبلی منزل میں میرے ہی پاس ٹھہرے، اس وقت انکی شرح مسلم کے کچھ اجزاء ساتھ تھے جن میں قراءت فاتحہ خلف الامام وغیرہ اختلافی مسائل پر مباحث تھے، ان کو جابجا سے مجھے سنایا، ایک اور دفعہ اسی زمانہ میں وہ اعظم گڈھ آئے، ٹھہرے کہیں اور جگہ تھے، مجھ سے ملنے آئے میں نے چائے پیش کی، تو پینے سے انکار کیا، انکار کی وجہ نہ معلوم ہوئی، مگر بعد کو خیال آیا تو قیاس ہوا کہ چائے کی پیالیاں جو جاپانی تھیں ان پر جانوروں کی تصویریں بنی تھیں، اس لئے ان میں پینے سے انکار کیا، بہرحال اس سے اُن کے تقویٰ اور بزرگوں کی صحبت کا اثر ظاہر ہوتا ہے،

مرحوم کی شرح مسلم جس کا نام فتح الملہم ہے لکھنے کا کام تمام عمر جاری رہا، اتنے بڑے کام کے لئے ان کو کسی ریاست سے امداد کی فکر تھی، چنانچہ اس کے لئے حیدرآباد دکن کا خیال تھا، اس کے لئے معروضہ پیش کیا اور آخر بڑے ردوکد کے بعد ریاست نے اس کی سرپرستی منظور کی، اور ہر جلد کے لئے کچھ امداد اور مصنف کیلئے ماہانہ وظیفہ منظور ہوا، اور مولانا نے جمعیتِ خاطر کے ساتھ اس کی چند جلدیں لکھ کر شائع کیں، اس سلسلہ میں یہ امر ذکر کے قابل ہے کہ جب ریاست نے ان کی امداد منظور کی تو مرحوم نے مجھے دوستانہ خط لکھا کہ اہلِ علم کی طرف سے ریاست کی اس کرمفرمائی کا شکریہ ادا کیا جائے، چنانچہ میں نے اس کی تعمیل معارف کے شذرات میں کی افسوس ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہی،

مرحوم سے میری آخری ملاقات اُس سال ہوئی جب جمعیۃ علمائے اسلام کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا، اور اس میں ان کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا گیا تھا جس کی اس زمانہ میں بڑی دھوم تھی، اور جس کے بعد مرحوم مسلم لیگ کی دعوت کی صف میں اہم عنصر کی حیثیت سے شامل ہوگئے، اور روز بروز ان کا تعلق لیگ سے بڑھتا ہی چلا گیا، مرحوم اس زمانہ میں بیمار تھے، نشست و برخاست سے معذور سے رہتے تھے، گھٹیے کا گمان تھا، اور میرٹھ کے کسی ہومیوپیتھ کے علاج سے فائدہ ہو رہا تھا، اتفاق سے اس زمانہ میں میرا دیوبند جانا ہوا تو ملاقات کو حاضر ہوا، بشاشت سے ملے، اور مجھ سے اپنے پیغام کے متعلق رائے پوچھی، تو میں نے اس کے نرم و ملائم لہجہ اور مصالحانہ انداز کی تعریف کی، اسی زمانہ میں ان کو حیدرآباد دکن کی ریاست اپنی عربی درسگاہ مدرسہ نظامیہ کی صدر مدرسی کے لئے پانچ سو ماہوار پر بلا رہی تھی، مرحوم اس کے قبول و عدم قبول میں متردد تھے، مجھ سے بھی اس میں مشورہ پوچھا، مجھے اس مدرسہ کا اندرونی حال جو معلوم تھا، وہ بیان کیا، اور عدم قبول کا مشورہ دیا، بہرحال مرحوم نے بھی وہاں جانا قبول نہیں کیا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لیگ کی خدمتوں میں ایسے الجھتے چلے گئے، کہ پھر دوسری طرف ان کو خیال کا موقع ہی نہیں ملا، اور آخر ۱۹۴۷ء میں لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ مرحوم بھی کراچی چلے گئے، اور وہیں کے ہوگئے،

مرحوم نے کراچی پہنچ کر کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہین کیا، مگر مذہبی معاملات مین ان کی حیثیت مشیر خاص کی تھی، اس لئے زبانِ خلق نے ان کو شیخ الاسلام کہکر پکارا، جو اسلامی سلطنتون مین عموماً قاضی القضاۃ کا لقب رہا ہے، اور زیادہ تر اس لقب کی شہرت دولت عثمانیہ مین رہی، اسی حیثیت سے مرحوم پاکستان کی مجلس آئین ساز کے رکن بھی تھے، اور اس جماعت کے روح رُوان تھے، جو اس آئین کو اسلامی قالب مین ڈھالنا چاہتی ہے، اور اس راہ مین مرحوم ہی کی ابتدائی کوشش کی کامیابی کا وہ نتیجہ تھا، جس کو پاکستان کی آئینی اصطلاح مین "قرارداد مقاصد" کہتے ہین،

مرحوم گو مستقل طور سے پاکستان چلے گئے تھے، مگر تعجب ہوگا کہ انھون نے نہ تو اپنا کوئی خاص گھر بنایا، نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا، بلکہ بعض عقیدتمند اہلِ ثروت کے مکان مین رہے، اور اسی مسافرت مین اس مسافر نے اپنی زندگی بسر کردی،

مرحوم مروت کے آدمی تھے اور اہلِ حاجت کی سعی و سفارش بدل وجان کرتے تھے، چنانچہ پاکستان کے اہلِ حاجت اور اہلِ غرض دونون ان سے فائدہ اٹھاتے رہے، اور وہ اپنی جاہ و منزلت کا ذرا خیال کئے بغیر ہر ایک کے کام آتے رہے، اور حکام کے پاس جاجا کر بے تکلف ان کی سفارشین کرتے رہے،

مرحوم کا آخری کام ایک عظیم الشان عربی درسگاہ کے قیام کا خیال تھا، چنانچہ اس کے لئے دینی مخلصین کی ایک جماعت بنائی تھی، میرے قیام حجاز کے آخری زمانہ مین مرحوم کی طرف سے اس جماعت کا دعوت نامہ مجھے بھی ملا تھا، اور انھون نے مجھے بھی اس مجلس کا ایک رکن بنایا تھا،

مرحوم کی صحت اخیر دنون مین اچھی نہ تھی، امسال پاکستان سے خیرسگالی کا ایک وفد حجاز جارہا تھا، اس کے ممبرون مین خواجہ شہاب الدین وغیرہ کے ساتھ مرحوم کا نام بھی تھا، مگر وہ اسی علالت کے سبب جا نہ سکے، اور ان کی جگہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی گئے، مرحوم پر فالج کا اثر تھا، جس سے ان کے دل و دماغ، اور جسمانی قوتون پر بڑا اثر تھا، اتفاق وقت یا تقدیر کا تماشہ دیکھئے کہ دسمبر مین جب سردی انتہائی نقطہ پر تھی وہ

جامعہ عباسیہ کی تعلیمی ضرورت سے بہاولپور گئے، جہان سنا ہو کہ اس وقت بڑی سردی تھی، اس کے بعد کا حال کراچی کے ایک رسالہ ندائے حرم مورخہ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء سے نقل کرتا ہون،

"۱۸ر صفر ۶۹ھ مطابق ۱۰ر دسمبر ۴۹ء کو حضرت علامہ مرحوم و مغفور جامعہ عباسیہ کی ایک تقریب مین شرکت کے لئے کراچی سے بہاولپور تشریف لے گئے، ۲۲ر صفر ۶۹ھ مطابق ۱۳ر دسمبر کی صبح تک طبیعت بالکل ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی، خلاف معمول اس روز ایک پیالی کے بجائے دو پیالیان چائے پی، اور فرمایا رات کو کچھ حرارت رہی، چنانچہ اسی وقت ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرکے طلب کیا گیا، ڈاکٹر نے بہت خفیف حرارت بتائی، اور دوا دیدی، دس بجے کے قریب سینہ مین غیر معمولی گھبراہٹ محسوس ہوئی، دوبارہ ڈاکٹر کو بلایا گیا، نبض کی رفتار اس وقت اپنی طبعی رفتار سے کچھ کم تھی، ایک طبیب اور دوسرے ڈاکٹر کو بھی طلب کرلیا گیا، بہاولپور کے وزیر تعلیم اور وزیر اعظم اور وزیر مال بھی پہنچ گئے، چار پانچ انجکشن دئیے گئے، مگر نبض کی رفتار کم ہوتی گئی، آخر گیارہ بجکر ۵ منٹ پر یہ آفتاب علم غروب ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

میت اُسی روز شام کو بذریعہ پاکستان میل ۸ بجے کے قریب بہاولپور سے کراچی روانہ کی گئی، اسی روز شام کو پاکستان کے اس مایہ ناز عالم باعمل کو لاکھون اشکبار آنکھون، اور سوگوار دلون نے سپرد خاک کیا، ڈیرہ نواب کے اسٹیشن پر نواب صاحب بہاولپور نے میت کی زیارت کی، اور اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا،"

کراچی کے اسٹیشن پر مسلمانون کے بہت بڑے مجمع نے میت کو اتارا، اور پہلے مرحوم کے قیامگاہ پر لائے، اور پھر وہان سے ان کے قیامگاہ کے سامنے ایک زمین مین جس کو عامل کالونی کہتے ہین دفن کیا گیا، سندھ کے اقطاع مین سے بہاولپور ہی وہ مقام ہے، جس سے دیوبند کے اکابر اور امداد اللّٰہی

سلسلہ کے مشائخ کو تعلق خاطر رہا ہے، اس لئے اگر مرحوم کی موت اسی سرزمین پر واقع ہوئی، تو عالم مثال کے حوادث میں کوئی عجیب چیز نہین ہوئی،

مرحوم کی کوئی ظاہری اولاد نہ تھی، لیکن بحمد اللہ کہ انھون نے اپنی کثیر باطنی اولاد چھوڑی ہے، یہ انکے تلامذہ ہین، جو زیادہ تر دیوبند اور بعض ڈابھیل مین اُن کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے ہین، ان مین بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہین، وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہون، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمان صاحب اعظمی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کہ ان مین سے ہر ایک بجائے خود دائرۂ علم ہے،

مرحوم کی پیدایش ۱۳۰۵ھ معلوم ہوئی ہے، اس لحاظ سے اُن کی عمر قمری صاحب سے چونسٹھ سال کی ہوئی، اس وقت جب مرحوم کے نصف صدی کے واقعات کو سپرد قلم کر رہا ہون، میرا دل کانپ رہا ہے، اور لب معاصر مسافر عدم کے لئے مغفرت کی دعا مین مصروف ہین، ایسے نادرۂ روزگار صاحب کمال صدیون مین پیدا ہوتے ہین، اللہ تعالیٰ ان کے مرقد کو پرنور فرمائے، اور اس پر اپنا ابر رحمت برسائے، وہ اب اس دنیا مین نہین، مگر ان کے کارنامے دنیا مین انشاء اللہ تعالیٰ حیات جاوید پائین گے،

سالہا از زمزمہ پرداز، جہان خواہد بود
زین نواہا کہ درین گنبد گردان زدہ است (س)

تاریخ سندھ

اس مین سندھ کا جغرافیہ آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا ان کی پوری تاریخ، ان تمام دورون کے علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مرتبہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین، اعظم گڈھ،

قیمت :- ۔ے ر — منیجر

ادبیات

نغمۂ حیات

از جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب ولی

شاعر آتشین نوا دیدے پیام زندگی
بیٹھے ہین لوگ بزم مین تشنہ بجام زندگی

ہاتف خوش کلام نے آکے کہا یہ سامنے
شاعر حق پرست ہے سن لو پیام زندگی

اس کو سکون حرام ہے گرم سفر مدام ہے
صرصر تیز گام ہے موج خرام زندگی

منظر صبح و شام مین محفل دور جام مین
کوشش ناتمام مین جلوۂ عام زندگی

گلشن لاجواب ہر کان در خوش آب ہے
معدن لعل ناب ہر سنگ رخام زندگی

فتح و شکست رزم مین لالہ و گل کی بزم مین
ذوق سفر کے عزم مین مستی جام زندگی

لب پہ صدائے ہاؤ ہو دل مین ہجوم آرزو
سر مین ہوائے جستجو حاصل کام زندگی

طلعت مہر نیم روز جلوۂ ماہ شب فروز
صاعقۂ نگاہ سوز حسن نظام زندگی

جلوہ گہ حیات مین کارگہ ممات مین
عرصہ کائنات مین رقص دوام زندگی

جذبہ خود سری مین ہے حملۂ قیصری مین ہے
غمزۂ دلبری مین ہے حسن خرام زندگی

معرکہ ستیز مین عرصۂ رستخیز مین
سایۂ تیغ تیز مین فیض حسام زندگی

حسن کی شرم ناز مین عشق کے سوز و ساز مین
سجدۂ پاکباز مین شورش عام زندگی

سوز دل پیمبری حملۂ تیغ حیدری
روح نیاز بوذری نقش دوام زندگی

جوشِ غبارِ کاروان جنبشِ موجۂ روان — ہمتِ مورِ ناتوان کوششِ گامِ زندگی

مجلسِ وجد و حال مین محفلِ قیل و قال مین — شوکتِ جاہ و مال مین نشۂ جامِ زندگی

سبزۂ نودمیدہ مین لالۂ نورسیدہ مین — غنچۂ چیدہ چیدہ مین شرحِ پیامِ زندگی

نغمۂ عیشِ کامران نالۂ دردِ بیکسان — زمزمہ ہاے طائران حسنِ کلامِ زندگی

طینتِ خود پسند مین طالعِ ارجمند مین — ہمتِ سربلند مین رفعتِ بامِ زندگی

تونے لکھی غزل ولی خوب ہی وجد آفرین

اس کا ہر ایک شعر ہے شرحِ پیامِ زندگی

غزل

از جناب شفیق صدیقی جونپوری

ہے کیا ذہو ش دیوانہ تری جلوون کا گردیدہ — قدم دیکھو تو شوریدہ نظر دیکھو تو سنجیدہ

چمن مین تازگی پاتے ہین گلہاے خزان دیدہ — خوشا تیری ہوای نازاے دامانِ جنبیدہ

نسیمِ جانۂ یوسف ترے دامن مین رقصیدہ — شمیمِ چادرِ مریم تری زلفون مین خوابیدہ

زبان پر ان کا نام آیا کہ آہین بند خشک آنسو — تمنا اتنی شایستہ جنون اور اتنا سنجیدہ

تمھاری خوش کلامی سے معطر ہے مسیحائی — تمھارا ہر نفس جیسے کہ بوے گل خرامیدہ

سنایا وصل مین فرقت کا افسانہ تو کہہ اٹھے — بھلا دو اس کہانی کو کہ دل ہوتا ہی رنجیدہ

وہ محوِ خواب، گیسو کا بکھرنا روے تابان پر — کہ جیسے چاندنی ہو رات کے دامن مین خوابیدہ

چمن مین باغبان اتنا مخالف ہے نشیمن کا — نظر آتی نہین اب کوئی شاخِ ناتراشیدہ

شکایت آسمان سے کیجیے کیا برقِ باران کی — ہزارون بلبلیان جب آشیانون مین ہون خوابیدہ!

ادا و موت کی دشواریون کو سوچنے والے — خبر بھی ہے تجھے خود زندگی ہے کتنی پیچیدہ

درِ عالی پہ پردہ ہے نگہبان آستانے پر — نگاہِ شوق شرمیلی، جمالِ یار پوشیدہ

کسی نے کہدیا تھا مسکرا کر اپنا دیوانہ — اسی دن سے مری شوریدگی ہے اور بالیدہ

شفیق اندر ہے کیفِ شوقِ نزدیکِ جانان

کہ جیسے قافلہ کا قافلہ لغزیدہ لغزیدہ

نیرنگِ حقیقت

از

جناب عتیق انجمی مالیگانوی

مجھے سلام کرا ہے میری منزلِ مقصود — بغیر اٹھائے ہوئے اٹھ گئے حجابِ قیود

نہ دے فریب مجھے اے مقامِ غیب و شہود — کہین نہین ہو مگر ہر جگہ ہے وہ موجود

عطا کیا ہے مجھے جس نے دردِ لا محدود — وہی ہے میری تمنا، وہی مرا مقصود

حضورِ غم کے تھپیڑے سے نہین جاتے — یہ جانتا ہون کہ ان مین ہے زندگی کی نمود

گذر کے دیکھ تو ذوقِ طلب سے اے رہرو — تجھے پکارنے آئے گی منزلِ مقصود

حضورِ دوست بہت سعی ضبط کی مین نے — ٹپک پڑے مگر آنکھون سے اشکِ خون آلود

خطا معاف کہ اندازِ بندگی مین نے — بدل لیے ہین کچھ از راہِ احتیاطِ سجود

یہ فیصلہ تری محفل سے ہو تو اچھا ہے — مجھے خبر نہین موجود ہون کہ نا موجود

بدل چکی ہے محبت ہزار رنگ مگر

عتیق! ہین مری آنکھین ہنوز اشک آلود

مطبوعات جدیدہ

تجدید تصوف و سلوک از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی تقطیع اوسط ضخامت ۴۹۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ ملنے کے پتے (۱) مولوی سعید الباری صاحب شبستان قدم رسول ہارڈنگ روڈ لکھنؤ، (۲) مکتبہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ، (۳) مکتبہ اشرفیہ اشرف المدارس، ہردوئی،

تصوف نام ہے ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے تحسین اعمال و کمال دین کا، لیکن مروجہ خانقاہی تصوف مین اس کی حقیقت بالکل چھپ گئی ہے، اور وہ محض چند غیر اسلامی رسوم و بدعات کا مجموعہ بن گیا ہے، اس سے تصوف کے متعلق بڑی غلط فہمی اور شکوک وشبہات پیدا ہوگئے ہین، اور کچھ لوگ سرے سے تصوف ہی کے منکر ہوگئے، ہندوستان مین سب سے اول حضرت مجدد سرہندیؒ نے تصوف کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کیا، اور اس دور مین حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اسکی تجدید و اصلاح فرمائی، اور قرآن مجید و احادیث نبوی کی روشنی مین تصوف کے مسائل کی تدوین، اس کی پرانی غلطیون کی اصلاح اور اس کے متعلق غلط فہمیون کے ازالہ کا عظیم الشان کام انجام دیا، اور بقول بعض مرتب تصوف کو تمام پرانی علمی و عملی غلطیون سے پاک و صاف کرکے اس حقیقت کو آئینہ کر دیا کہ تصوف نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا، حضرت مولاناؒ کی یہ تجدیدات و اصلاحات اور تصوف و سلوک کے مسائل ان کی تصانیف، مواعظ اور ملفوظات کے ہزارون صفحات مین بکھرے ہوئے ہین جن سے ہر شخص

آسانی کے ساتھ استفادہ نہین کرسکتا، اس لئے ضرورت تھی کہ اُن کو چن کر ترتیب کے ساتھ کتابی شکل مین مرتب کر دیا جاتا، تاکہ اردو مین تصوف پر ایک جامع کتاب ہوجاتی اور لوگون کو اس سے استفادہ آسان ہوجاتا، اس فرض کفایہ کو حضرت مولاناؒ کے خلیفہ راشد جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے، جو ہر حیثیت سے اس کام کے اہل ہین، انجام دیا، وہ حضرت مولاناؒ کے فیض صحبت کا علمی نمونہ، اُن کی تعلیمات اور ارشاد و ہدایت کے عالم و عارف بھی ہین، اور ایک کہنہ مشق ادیب و صاحب قلم بھی، انھون نے مولاناؒ کی تصانیف اور تحریرون سے تصوف و سلوک کی روح اس کتاب مین کھینچ دی ہے، اور اپنی تشریحات سے ان کو نہایت واضح، روشن، مدلل اور دلنشین بنا دیا ہے، اس طرح یہ کتاب صحیح معنون مین حقیقی تصوف کا آئینہ ہوگئی ہے، جس مین اس کی تمام غلطیون کی اصلاح، غلط فہمیون کا ازالہ، اور سلوک و تصوف کی اصلی صورت نظر آتی ہے، اس کو پڑھنے کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کے دل مین تصوف کے متعلق کوئی شک وشبہہ باقی نہین رہ سکتا، اور وہ اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوگا کہ "تصوف نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا" کتاب کے شروع مین حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے حضرت مولاناؒ کی تجدیدات و اصلاحات پر جامع تبصرہ ہے، مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ایک بڑا مذہبی و علمی فرض انجام دیا جس کے لئے وہ مسلمانون کے شکریہ کے مستحق ہین، یہ کتاب ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے،

کلمۂ طیبہ از مولانا غوث علی شاہ المعروف بہ غوثی شاہ صاحب قادری چشتی حیدرآبادی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۳۲ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت درجہ اول عہ درجہ دوم عہ مجلد کی قیمت ایک روپیہ زیادہ ہوگی، پتے:- (۱) بیت النور چنچل گوڑہ حیدرآباد (۲) عبدالقادر صاحب تاجر کتب، چارکمان حیدرآباد، (۳) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن،

اسلام کا کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک تخم ہے، جس مین شجر اسلام

کے سارے برگ و بار پنہان ہین، اور اس مختصر کلمہ مین اسلام کے تمام بنیادی ارکان اور اسلامی تعلیم کا خلاصہ آگیا ہی، اور شرک یا غیر اللہ کی نفی، توحید کے اقرار اور رسالتِ محمدی کی تصدیق سے ان تینون ارکان کی جامع و مانع، اور کمالی شکلین مراد ہین، یعنی لا الہ کے معنی شرک کی ان تمام علمی و عملی اور خفی و جلی شکلون کی نفی ہی، جن مین اس کا خفیف شائبہ بھی نکلتا ہو، اور الا اللہ سے مراد صرف ایک ذات کی الوہیت پر ایمان کے ساتھ الوہیت و معبودیت کے سارے اوصاف و خصائص کا عملی اقرار ہے، اور رسالتِ محمدی کی تصدیق کا مقصد صرف دین اسلام کی صداقت پر ایمان اور دوسرے بگڑے ہوئے دینون سے برأت ہی، اس کتاب مین اسی نقطۂ نظر سے کلمۂ طیبہ کی تشریح اور اس کے مضمرات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ تشریحات نہایت جامع ہین، اور ان مین اسلام کے تمام بنیادی عقائد و اعمال کا خلاصہ آگیا ہے، البتہ کتاب کے بعض مباحث دقیق اور ان کا طرز تعبیر صوفیانہ اور کہین کہین پرانے طرز کا فلسفیانہ ہے جس سے عبارت مین پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے، لیکن مصنف کے صوفیانہ ذوق و شوق کے باوجود ان کا قلم توحید کے جادۂ مستقیم اور شریعت کے دائرہ سے باہر نہین نکلا ہے، اور جا بجا غلط متصوفانہ عقائد و اعمال کی تردید کی گئی ہی، مگر یہ کتاب خواص کے مطالعہ کے لائق ہے، عوام اس سے فائدہ نہین اٹھا سکتے،

مشاہیر مہدویہ (جلد اول) مؤلفہ جناب سید عزیز مہدی صاحب بخاری، تقطیع بڑی،
ضخامت ۱۶۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عمر، پتے:- دارالاشاعت مہدویہ چن پٹن (۲) سید اسد اللہ خوندمیری کتب فروش چن پٹن،

فرقۂ مہدویہ سید محمد جونپوری المتوفی ۹۱۰ھ کی جانب منسوب ہی، وہ اپنے زمانہ کے ممتاز عالم و زاہد تھے، نوین صدی ہجری مین انھون نے مہدویت کا دعویٰ کیا، اس زمانہ کے علما نے اس کی بڑی مخالفت کی، لیکن دکن اور گجرات مین اُن کی دعوت مقبول ہوئی، احمد نگر کے بعض نظام شاہی سلاطین اُن کے عقیدت مند ہوگئے، اس سے دکن مین اُن کی دعوت کو بڑا فروغ حاصل ہوا، اور وہان ان کے

ماننے والون کی ایک جماعت پیدا ہوگئی، اور مہدیون کو دکن مین بڑا عروج حاصل ہوا، اور وہ دکنی حکومتون مین بڑے بڑے مناصب پر ممتاز ہوے، حیدرآباد اور مدراس وغیرہ مین آج بھی مہدوی موجود ہین، لائق مصنف نے جو خود مہدوی ہین، اس کتاب مین ان ممتاز مہدویون کے حالات لکھے ہین جن کا تعلق دکن کی حکومتون سے رہا ہے، کتاب کے شروع مین دیباچہ اور بہمنی حکومتون کے زمانہ مین سے لے کر ارکاٹ اور میسور کی نوابی کے عہد تک دکن کی ہندو مسلمان حکومتون کا مختصر ذکر ہے، اس کے بعد ان حکومتون سے متوسل مہدوی عہدہ دارون کے حالات ہین، شمالی ہند مین مہدویون کا وجود نہین ہی، اور یہان ان لوگون کے علاوہ جن کی نظر تاریخ پر ہے، عام طور سے مہدوی فرقہ کے نام تک سے لوگ ناواقف ہین، اس لئے ضرورت تھی، کہ کتاب کے شروع مین فرقۂ مہدویہ کی مختصر تاریخ لکھ دی جاتی، تاکہ اس کے پڑھنے والون کو یہ تو معلوم ہو جاتا، کہ فرقۂ مہدویہ سے مراد کون لوگ ہین، کتاب مہدویون اور دکن کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

تحقیقی نوادر، از محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ ایم اے لکچرار مہارانی کالج میسور، تقطیع بڑی،
ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر مجلد، قیمت مرقوم نہین، مصنفہ سے ملے گی،

یہ کتاب لائق مصنفہ کے دس علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہی، انشاء کے شورش پسند حریف، انشا کے مربی الماس علی خان اور نواب سعادت علی خان، قواعد اردو و رسم الخط، خلاصۂ تذکیر و تانیث فعل از دریاے لطافت، اعلانِ نون، تنقید دستور الفصاحت، مرتبہ مولانا امتیاز علی خان عرشی، حضرت کیفی اور دریاے لطافت کا اردو ترجمہ، ہندوستان مین فارسی کا نشو و نما، اکبر الہ آبادی اور پردہ، اصلاح زبان اور خواتین، ان مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کا علمی و ادبی ذوق سنجیدہ اور اردو زبان و ادب پر انکی نگاہ گہری، اور وسیع ہے، تنقیدی مضامین خصوصیت کیساتھ مصنفہ کی وسعت و دقت نظر اور تلاش و تحقیق کا نمونہ ہین، نئی پود مین عورتون کا کیا ذکر، مردون مین بھی صحیح علمی مذاق کا فقدان ہے، ایسی حالت

ہین ایک خاتون کے قلم سے ایسے مفید علمی مضامین اور بھی زیادہ لائق تحسین وآفرین ہین، مضامین سے اندازہ ہوتا ہو کہ آیندہ اردو زبان کے ادیبون کی صف مین مصنفہ کی ممتاز جگہ ہوگی،

نماز اور ترقی کی تین راہین از جناب مولانا محمد علی صاحب امیر جماعت احمدیہ لاہور تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۲ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت تحریر نہین، پتہ :- منیجر دار الکتب اسلامیہ نمبر ۱۰۰، اعظم پورہ ملک پیٹھ حیدرآباد دکن،

اسلام مین نماز راس العبادات ہے، اور قرآن مجید واحادیث نبوی مین اس کے بڑے فضائل اور دینی ودنیوی برکات بیان کئے گئے ہین، بہت سے علماء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تشریح وتفصیل بیان کی ہے، مولانا محمد علی لاہوری نے بھی نماز کی حقیقت اور اس کے فوائد وثمرات پر ایک تقریر کی تھی، اس کو کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا ہے، اس مین مقرر نے نماز کے ارکان، اور اس کی دعاؤن کے اسرار وحکم کو موجودہ اصطلاح مین اس کے فلسفہ کی روشنی مین دکھایا ہے کہ نماز ہی مسلمانون کی ہر قسم کی روحانی اور مادی فلاح کا ذریعہ ہے، اس سے انفرادی تطہیر وتزکیہ بھی حاصل ہوتا ہے، اجتماعی وقومی فلاح و سعادت بھی اور حق وصداقت کا اعلاء بھی جو اسلام کا اصل مقصود ہے، مصنف کا نقطۂ نظر اور تشریحات خالص دینی ہین لیکن اتنی نفسیاتی اور دلنشین ہین کہ اس سے عقل پرست بھی انکار نہین کر سکتے، اس حیثیت سے یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ تعلیم یافتہ مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے، البتہ ایک دو معانی پر کھٹک پیدا ہوتی ہے، مثلاً فصل لربک وانحر مین "نحر" یعنی جانورون کی قربانی کے معنی ایثار وقربانی یعنی Sacrifice کے لئے گئے ہین، جو محل نظر ہے، دوسرے "رفع" کی تشریح مین مصنف نے حضرت عیسیٰ کے رفع کے متعلق اپنے عقیدہ کی تبلیغ کر دی ہے، جس کا یہ محل نہین تھا، اس لئے کہ یہ رسالہ عام مسلمانون کے فائدہ کا ہے، لیکن اس سے اس رسالہ کی خوبی مین کوئی فرق نہین آتا،

"م"

جلد ۶۵ ماہ رجب المرجب ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۰ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب المراسلۃ والمکاتبہ

وفیات